راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کے 25 کامیاب سال

Monthly
Arzang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مارچ ۲۰۲۵ء

مدیرِ اعلیٰ:
عامر بن علی

مدیران:
حسن عباسی
لبنیٰ صفدر

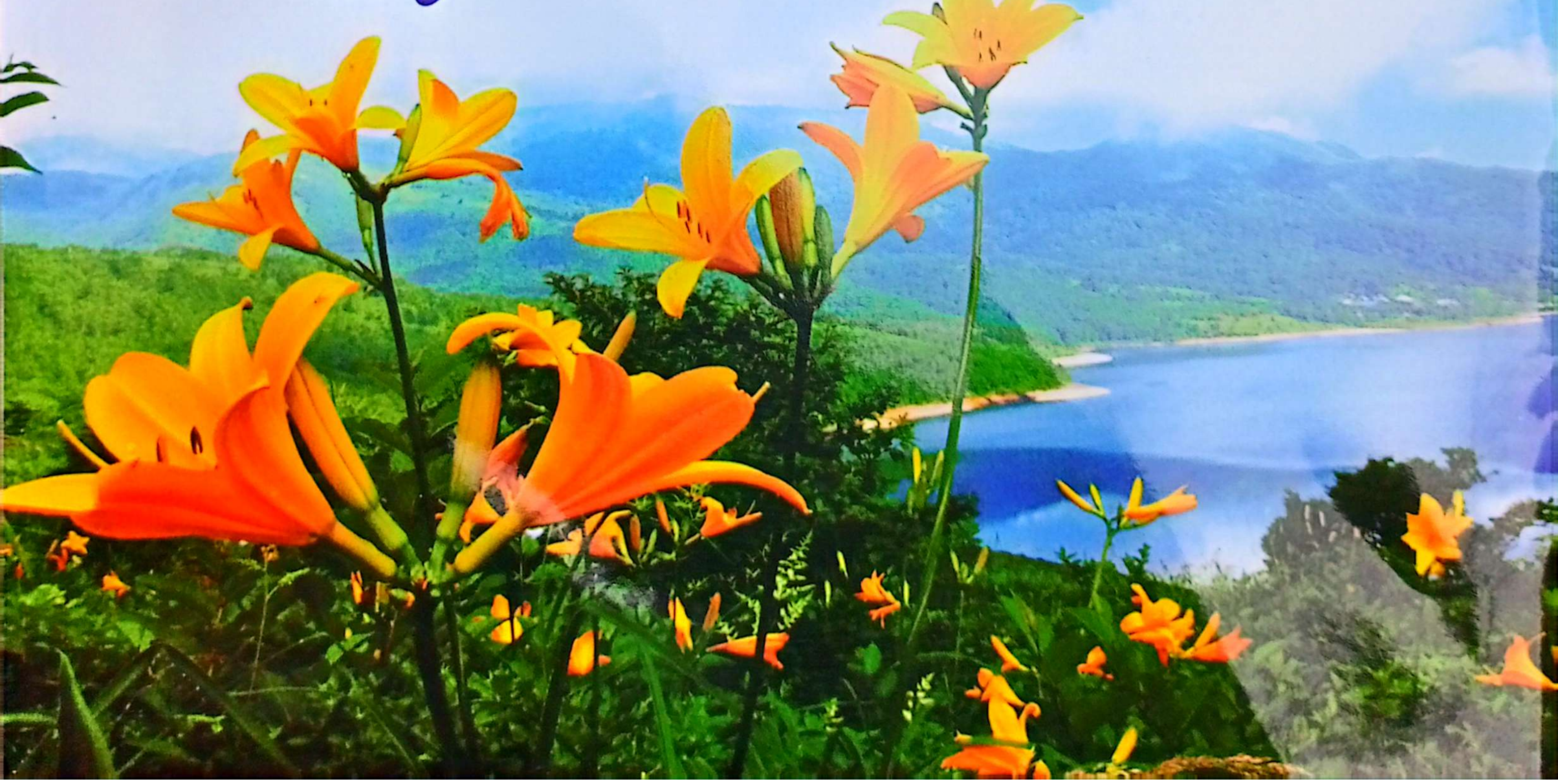

CamScanner

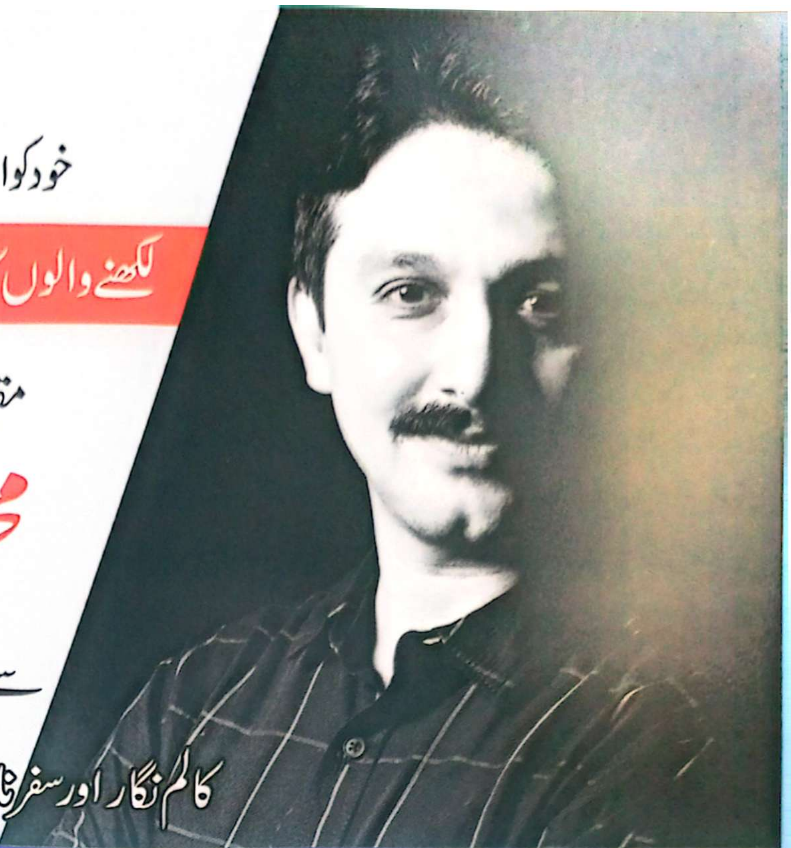

خود کو اتنا آدرشی نہیں سمجھتا کہ کسی ادبی تحریک کا حصہ بن سکوں

لکھنے والوں کا مشاہدہ اور اس کا اظہار ادب سے شوق کی وجہ بنا

مقبول کہانی نویس اور ''ریل کی سیٹی'' کے خالق

محمد حسن معراج

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر، کالم نگار اور سفرنامہ نگار **عامر بن علی** کی خصوصی گفتگو

تخلیق کا سفر انفرادی سرشاری سے شروع ہو کر اجتماعی نمو تک کا دورانیہ ہے۔ محمد حسن معراج

سیاچن گلیشیئر کی برفانی چوٹیوں پر پہرہ دینے والا فوجی افسر اتنا خوبصورت افسانہ نگار بھی ہو سکتا ہے، میرے لئے یہ حیرت کی بات تھی۔ حسن معراج کی معیاری تحریریں اربابِ ذوق بڑے شوق سے پڑھتے ہیں اور ان سے ہمارا تعارف بھی ان کا منفرد طرزِ تحریر ہی تھا، قلم سے ان کے رشتے کے سبب ہم نے ان سے انٹرویو کی فرمائش کی اور اسی گزارش کے ساتھ سوالنامہ بھی بھجوا دیا۔ خوشگوار حیرت اس بات پر تھی کہ ان میں شاعرانہ تساہل نہیں ہے بلکہ بڑے متحرک اور ڈسپلن والے آدمی ہیں۔ بے لاگ گفتگو اور زندگی کے بارے میں بڑے واضح نظریات رکھتے ہیں۔ یہ تو بہت دن بعد پتہ چلا کہ وہ فوج کے تعلقات عامہ میں افسر بھی رہے ہیں اور بطور میجر اپنی خدمات سر انجام دیتے رہے ہیں۔ ہم اہلِ قلم میں یہ معیوب سمجھا جاتا ہے کہ کسی ادیب سے اس کا ذریعہ روزگار پوچھا جائے، اس تلخ حقیقت کے باوجود کہ لوح و قلم کی پرورش کرنے والے مشکل سے ہی اسے وسیلۂ روزگار بنا پاتے ہیں۔

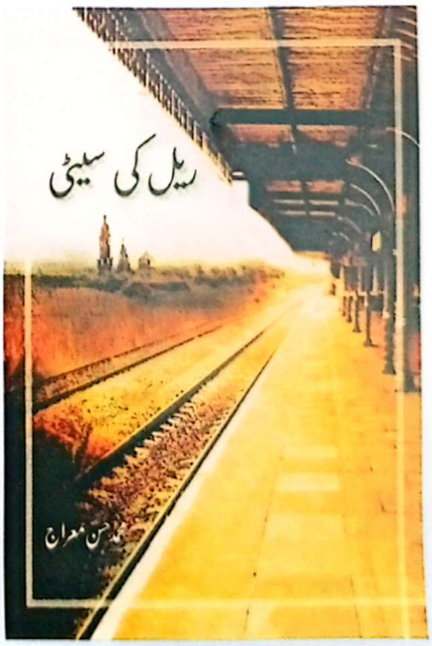

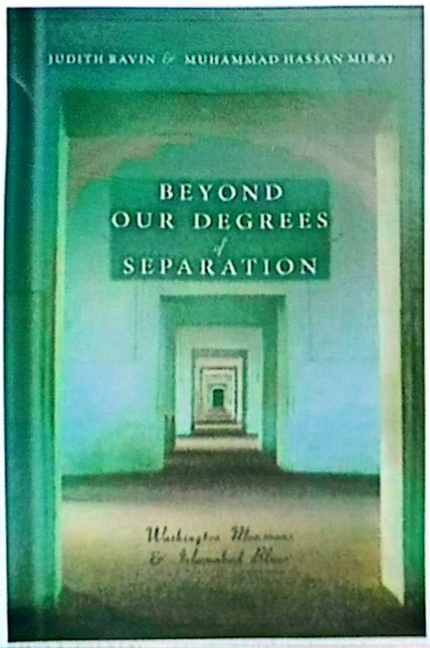

محمد حسن معراج سے ارژنگ کے قارئین کے لئے کی گئی گفتگو حاضرِ خدمت ہے۔

س بچپن کہاں گزرا؟ گرد و پیش کے حالات کیسے تھے؟

ج پیدائش لائل پور کی ہے۔ گرد و پیش کے حالات ویسے ہی تھے جیسے 80 کی دہائی میں وسطی پنجاب کی شہری آبادیوں میں ہوا کرتے تھے۔ ابا سرکاری افسر تھے لیکن اس کے ساتھ شام کے اوقات میں کاروبار سے بھی وابستہ تھے۔ حساب کتاب کے آدمی تھے لیکن انسانی معاملات میں سود و زیاں سے ماورا تھے۔ اماں چوکا باسن کرنے سے جب فارغ ہوتیں تو کوئی کتاب پڑھتی تھیں۔ بس سادہ سا گھر تھا۔ ایک بوڑھی دادی تھی، جس کی جھریوں میں واقعی صدیوں کا پھیرا تھا۔ میں اور وہ ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے بڑے بوڑھے ہو رہے تھے۔

س ادب سے شوق کی ابتداء؟

ج ابا کی کتابیں گھر کے ایک کونے میں موجود ہوتی تھیں۔ وہاں سے پڑھنا شروع کیا، پی اے ایف کالج تک جاتے جاتے تقریباً عادت بن گئی تھی۔ کالج میں خاصا وقت تھا لہٰذا عادت پختہ ہو گئی۔ ادب سے شوق کی بنیادی وجہ لکھنے والوں کے مشاہدے اور اس کا اظہار ہے۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِاہتمام مسلسل اشاعت کے 25 کامیاب سال

MONTHLY Arzang LAHORE

ماہنامہ ارژنگ لاہور

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

مارچ 2025ء جلد 26 شمارہ 3

مدیرِ اعلیٰ
- عامر بن علی

مدیران
- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلسِ ادارت
- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

مجلسِ مشاورت
- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹوگرافر: نعمان حسن 0333-4918383

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ ''ارژنگ'' کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

فہرست

حمد و نعت ' 2

مضامین:
- وہ کام جو اقبالؔ ادھورے چھوڑ گئے / جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال' 3
- پاکستانی ادب کا مسئلہ / ڈاکٹر انور محمود خالد ' 7
- پاکستانی غزل اکیسویں صدی میں (روایتی موضوعات)/لبنیٰ صفدر ' 15
- روشنی کی جھلمل میں طنطناتی شاعری / عبدالوحید بسمل ' 18
- پانچویں موسم کا شاعر...... بیدل حیدری / غزالہ انجم ' 21

شعری گوشے: محمود شام ' احمد ندیم رفیع ' خاور اعجاز 25 تا 23

مضامین:
- ''گیت گاتا چل'' /جنید آذر ' 26
- افتخار شفیع کی شاعری میں حرفِ معتبر کی تلاش/ ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی ' 27
- سندھی لوک گیت / مرزا کاظم رضا بیگ ' 30

بقیہ انٹرویو: محمد حسن معراج ' 33

یادِ رفتگاں
- احمد ندیم قاسمی کی یادیں / عامر بن علی ' 34
- کولسری صاحب / حسن عباسی ' 36

شعری گوشے: امین اوڈیرائی ' شہزاد تابش ' قیصر عباس زیدی 43 تا 41

افسانے:
- تعاقب / پروفیسر نور کمال شاہ ' 44
- میں کاشر / کلیم خارجی ' 46

افسانچے:
- انجینئر ظفر محی الدین ' ابن عاصی 49 تا 48

سفرنامہ:
- بکنگھم پیلس / فقیراللہ خاں ' 50
- شاعری ' 51
- ادبی تقریبات ' 52
- شہر میں گاؤں کے پرندے / روداد: ڈاکٹر ساجد علی ' 54
- نامہ ہائے احباب ' 56

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

حمد و ذکرِ خدا

خدا کے ذکر سے تسکین کے مرغزار میں ہے
خوشا کہ طالبِ حق حالتِ قرار میں ہے
خدا کا ذکر خفی ہو کہ ذکر جہری ہو
جہانِ کیف و خوشی ذکر کی بہار میں ہے
خدا کے ذکر میں بندہ جو محو رہتا ہے
وہی فلک پہ سدا یادِ کردگار میں ہے
خدا کے ذکر سے بندہ اگر رہے غافل
سدا وہ پنجۂ ابلیسِ نابکار میں ہے
کلامِ حق کی تلاوت ہو یا نبیؐ پہ درود
صلوٰۃ و صوم بھی سب ذکر کے شمار میں ہے
خدا کے خوف سے رونا ہے ذکر اللہ کا
ندائے رحم و کرم اشکِ تابدار میں ہے
لبوں پہ جس کے ہو ذکرِ خدا کی تابانی
وہ خوش نصیب بھرا نورِ بے شمار میں ہے
ملے جو حمد کی توفیق، ہے کرم اس کا
نصیب ذکر کرے، رب کے اختیار میں ہے
کروں جو ذکر خدا کا تو یہ لگے اختر
عجب سکون مرے قلبِ بے قرار میں ہے

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر

خوش نصیبی مجھ کو لے آئی ہے پھر حرمین میں
میں بھی حاضر ہوں سلامی کے لیے قدمین میں
کوئی منظر کیا بچے گا اب بھلا کونین میں
گنبدِ خضریٰ بسا ہے جب مری عینین میں
ہیں نظر کے سامنے پھر وہ سنہری جالیاں
ایسی نعمت مل نہیں سکتی کہیں دارین میں
کعبہ و طیبہ میں آئیں سب مسلماں شوق سے
بارشیں رحمت کی برسیں ہر گھڑی حرمین میں
پاک و طاہر ہو کے جائیں اُمتی سرکارؐ کے
داغ دھل جاتے ہیں عصیاں کے سبھی حرمین میں
محفلِ میلاد کا کرنا ہمیشہ اہتمام
ارفع و اعلیٰ سعادت ہے یہی دارین میں
حق و باطل ہیں جدا فرمان ہے سرکار کا
فاصلہ رہتا ہے جیسے دائمی قطبین میں
نُور ہے کعبہ بھی اختر، نور ہے طیبہ نگر
میری قسمت بھی منوّر ہو گئی نورین میں

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر

زِ سوئے اللہ مدام اُنؐ پر
درود اُنؐ پر، سلام اُنؐ پر
یہ مہ جبینوں، حسینوں کے سب
ہیں شیدا ناز و خرام اُنؐ پر
خدا کے ہیں جو رسول، بندے
درود لاکھوں، سلام اُنؐ پر
نبی نہ آئے گا بعد اُنؐ کے
یہ سلسلہ ہے تمام اُنؐ پر
زبان اُنؐ کی، کلام برحق
ہوا جو نازل کلام، اُنؐ پر
فرشتے آتے ہیں لے کے مدحت
کے مالا، گجرے، نظام اُنؐ پر
زہے مقدر، میں اُنؐ کے در پر
ہوں محو نعت و سلام اُنؐ پر
صحیفۂ دل، کلامِ زائرؔ
ہے عنواں جس کا "سلام اُنؐ پر"

عبدالقیوم زائرؔ / امریکا

نبیؐ کی نعت کہنے کے بڑے آداب ہوتے ہیں
سخن جبریل کا قرآن سے القاب ہوتے ہیں
جہاں نعلین اقدس آپ نے اپنے اُتارے ہیں
زمیں حسنِ معلّی ذرّے بھی مہتاب ہوتے ہیں
وہ سلمان و عمر صفہ کے مکتب میں پڑھیں جن کو
نصابِ عشق شاہِ دیں کے جن میں باب ہوتے ہیں
نبیؐ کی آل دیں پہ سر کٹانے کے لیے آئی
نبیؐ پہ سر کٹانے کے لیے اصحاب ہوتے ہیں
ضروری ہے بمقام مصطفیٰؐ کے واسطے قرآں
رموزِ حرفِ قرآں کے لیے اعراب ہوتے ہیں
جہاں غنچہ و گل شاخیں درودِ پاک پڑھتے ہوں
خزاں کا کام کیا وہ گلستاں شاداب ہوتے ہیں
مقامِ عشق ملتا ہے نبیؐ کی یاد سے ان کو
عطا سجدوں کی لذت ماتھوں پہ محراب ہوتے ہیں
اُحد، طائف، تبوک و بدر، خیبر سے صدا آئی
کہ دیں کو پھیلنے کے بھی تو کچھ اسباب ہوتے ہیں
نرالے رنگ بخشتے ہیں نبی نے یوں ولایت کو
طریقت میں ولی، ابدال، غوث اقطاب ہوتے ہیں
جنہیں پانی ملے عشقِ محمدؐ کا امیں ساجد
نہیں تشنہ کبھی رہتے سدا سیراب ہوتے ہیں

محمد امین ساجد سعیدی / حاصل پور

CS CamScanner

وہ کام جو اقبالؔ ادھورے چھوڑ گئے

جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال

بعض اہم موضوعات پر علامہ اقبال نے شعر یا نثر میں کچھ نہ کچھ تحریر کرنے کے منصوبے تو بنائے مگر زندگی نے وفا نہ کی، اس لیے اُن کی تکمیل نہ ہو سکی۔ مثلاً مہاراجہ کشن پرشاد کو خط میں ''بھگوت گیتا'' کا اردو اشعار میں ترجمہ کرنے کے ارادے کا ذکر کرتے ہیں۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو خط میں انگریزی میں ایسی کتاب لکھنے کا ذکر کرتے ہیں جس کا عنوان ہوگا ''اسلام میرے نقطۂ نگاہ سے''۔ نذیر نیازی فرماتے ہیں کہ حادثہ کربلا پر ہومر کے ''اوڈیسے'' کی طرز پر ایک طویل نظم لکھنا چاہتے تھے۔ ''جاوید نامہ'' میں اضافی ارواح سے ملاقاتوں کے بارے میں لکھنے کا سوچتے تھے۔ انگریزی میں ''ایک غیر معروف پیغمبر کی کتاب'' تحریر کرنے کا منصوبہ تھا۔

آخری ایام میں نواب بھوپال سے وعدہ کیا کہ ''اجتہاد کی تاریخ و ارتقا'' کے موضوع پر کتاب لکھیں گے۔ اس سلسلہ میں میاں محمد شفیع (م۔ش) سے انگریزی میں کچھ ابتدائی نوٹس بھی لکھوائے گئے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے نام خط مورخہ 28 مئی 1937ء میں فلاحی ریاست کے قرآنی تصور کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اصل سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے؟ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ اور جدید نظریات کی روشنی میں اُس کی آئندہ ارتقاء میں حل موجود ہے۔ اسلامی قانون کے طویل اور محتاط مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر یہ ضابطۂ قانون صحیح طور پر سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو ہر ایک کے لیے کم از کم زندہ رہنے کا حق محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قانونِ شریعت کا نفاذ اور ارتقا اس سرزمین میں ناممکن ہے جب تک کہ آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ لائی جائیں۔ اسلام کے لیے ''سوشل ڈیماکریسی'' کو کسی مناسب شکل میں، جو اسلامی قانون کے اصولوں کے مطابق ہو، قبول کر لینا ''انقلاب'' نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف واپس جانا ہے۔''

ان منصوبوں میں بعض تو ادبی نوعیت کے ہیں، بعض کا تعلق فلسفہ، مابعدالطبیعات یا دینیات سے ہے اور بعض خالصتاً عنقریب وجود میں آنے والی مسلم ریاست (پاکستان) کی عملی، سیاسی اور معاشی ضروریات سے متعلق ہیں۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ، حادثہ کربلا پر ہومر کے اوڈیسے کی طرز پر نظم لکھنا یا ''جاوید نامہ'' میں اضافی ارواح شامل کرنا، ایسے ادبی منصوبے تھے جو شاعر کے تخلیقی سمندر میں مضطرب لہروں کی طرح ابھرے اور ڈوب گئے۔ لیکن باقی منصوبوں کے بارے میں ایسا گمان کرنا درست نہ ہوگا۔ ''اسلام میرے نقطۂ نظر سے'' یا ''ایک غیر معروف پیغمبر کی کتاب'' جیسی کتب تحریر کرنے کا اگر اُنہیں موقع مل جاتا تو تخلیقی سوچ کے اعتبار سے وہ خطبات ''اسلامی فکر کی تشکیلِ نو'' کی توسیع ہوتیں۔ اسی طرح ''اجتہاد کی تاریخ و ارتقا'' اور ''فلاحی ریاست کا قرآنی تصور'' کے موضوعات پر اگر وہ کتب تحریر کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو اُن کے افکار مسلمانانِ پاکستان کی مزید فکری رہبری کا باعث بن سکتے تھے۔

خطبات ''تشکیلِ نو'' کن کے لیے تحریر کیے گئے؟ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

''اِن لیکچروں کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفہ سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفہ اسلام کو فلسفہ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے خیالات میں خامیاں ہیں تو اُن کو رفع کیا جائے۔''

جب یہ لیکچر علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء نے سنے تو صدر شعبہ فلسفہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے علامہ اقبال سے کہا:

''جنابِ والا! آپ نے اسلام میں فلسفہ دین کی تشکیلِ نو کی بنیاد رکھ دی۔ مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلیں اُس کے لیے آپ کے ممنونِ احسان ہیں۔ آپ کی فکر افزا مثال اور لوگوں کی بھی ہمت بندھائے گی۔''

خطبات کے ایک مبصر سلیم احمد تحریر کرتے ہیں:

''اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب کا چیلنج ایک نئی الٰہیات کی تشکیل کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اقبال کی نئی الٰہیات کی کوشش کا حقیقی مقصد مغربی اور اسلامی تہذیب کے درمیان مشترکہ عناصر کی جستجو ہے۔ اگر ہمیں مغربی تہذیب کو قبول کرنا ہے یا اسے اپنے اندر جذب کر کے فائدہ اٹھانا ہے تو ہمیں مغربی اور اسلامی تہذیب کی روح میں اتر کر اُن کی ہم آہنگی کو الٰہیاتی بنیادوں پر ثابت کرنا پڑے گا۔ ''تشکیلِ جدید'' ان ہی معنوں میں ایک زبردست کارنامہ ہے جسے جدید اسلام کی بائبل کہنا چاہیے۔''

یہ سب اپنی جگہ درست۔ حقیقت یہی ہے کہ خطبات علامہ اقبال کی ایسی تصنیف ہے جسے علماء نے اگر پڑھنے کی کوشش کی تو اُسے ناپسند فرمایا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے تو صاف کہہ دیا کہ یہ کتاب اگر نہ لکھی جاتی تو بہتر ہوتا۔ جہاں تک مسلمانوں کی ''مغرب زدہ'' نئی نسل کا تعلق ہے۔ انہوں نے خطبات کو، جس توجہ کے وہ مستحق تھے، نہیں دی۔ پس علامہ اقبال کی ''فکر افزائی'' اوروں کی ہمت نہ بندھا سکی۔

خطبات کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ انہیں تحریر کرنے کی کئی وجوہ تھیں۔ پہلی یہ کہ علامہ اقبال کو احساس تھا کہ دنیائے اسلام ہر طور پر مغرب کی طرف جھکتی چلی جا رہی ہے۔ وہ اِس تحریک کے مخالف نہ تھے کیونکہ یورپی تہذیب عقل و دانش کے اعتبار سے انہی نظریات کی ترقی یافتہ صورت پیش کرتی ہے جن پر اسلام کی تمدنی تاریخ کے مختلف ادوار میں غور و فکر کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں وہ یورپی تہذیب کو ایک

CS CamScanner

طرح سے اسلامی تہذیب ہی کی توسیع خیال کرتے تھے۔ اور مسلمانوں کی نئی نسل کے اِس مطالبے کو جائز سمجھتے تھے کہ اسلامی عقائد اور نظریۂ حیات کا ایک بار پھر جائزہ لے کر ایسی نئی تعبیر یا تشریح کی ضرورت ہے جو وقت کے جدید تقاضوں سے مطابقت رکھتی ہو۔ انہیں خدشہ صرف اس بات کا تھا کہ مادہ پرست یورپی کلچر کی ظاہری چمک دمک ہمیں اتنا متاثر نہ کر دے کہ ہم اُس کلچر کے حقیقی باطن تک پہنچ سکنے کے قابل نہ رہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ بقول اقبال انسان مختلف قسم کے رشتوں کے ذریعے خدا اور کائنات سے جڑا ہوا ہے۔ لہٰذا مطالعہء فطرت یا سائنسی تحقیق بھی اپنی طرح کی عبادت ہے۔ وہ مسلمانوں کی نئی نسل کی توجہ سائنسی علوم کی طرف مبذول کرنے کی خاطر اُن پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ اسلام روحانی دنیا کے ساتھ مادی دنیا کو بطور حقیقت تسلیم کرتا ہے اور انسان کو مشاہداتی یا تجربی علوم کی تحصیل سے تسخیر کائنات کی دعوت دیتا ہے۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ علامہ اقبال کے نزدیک روحانی (یا مذہبی) تجربہ بھی ایک نوع کا علم ہے جسے دیگر علوم کی طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے خطبات میں فکری نقطۂ نگاہ سے اسلام کو بطور ارفع مذہب پیش کیا اور بعض آیات کی تعبیر سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مابعد الطبیعات، طبیعات یا مادے اور زمان و مکاں سے متعلق فکری یا تجربی علوم کے نئے انکشافات کی تصدیق قرآن سے کی جا سکتی ہے۔

خطبات کا مطالعہ مختلف جہتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اور اُنہیں تحریر کرنے کی اور وجوہ بھی بیان کی جا سکتی ہیں۔ جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے، اگر علامہ اقبال ''اسلام میرے نقطۂ نگاہ سے'' یا ''ایک غیر معروف پیغمبر کی کتاب'' لکھنے میں کامیاب ہو جاتے تو یقیناً وہ خطبات ''تشکیلِ نو'' کی توسیع ہوتیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ یہ کام صرف علامہ اقبال خود ہی انجام دے سکتے تھے۔ اس میدان میں اُن کی ''فکر افزا'' مثال نے پہلے کسی کی ہمت نہ بندھائی تو اب کیا بندھائے گی؟

اب علامہ اقبال کے ''اجتہاد کی تاریخ وارتقا'' کے موضوع پر کتاب لکھنے کے ارادے کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ''اجتہاد'' کے مطالبے میں علامہ اقبال نے پہل نہیں کی۔ برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی و تمدنی زوال و انتشار کے عالم میں دراصل شاہ ولی اللہ نے اس مسئلہ کو اٹھایا اور اپنے وضع کردہ فقہی اصول ''تلفیق'' کے تحت اہل سنت والجماعت فرقہ کو اُن کے چار مدرسہ ہائے فقہ (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) میں سے ہر کسی معاملے میں سب سے سہل اور راہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔ یہ صحیح معنوں میں اجتہاد تو نہ تھا مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سنّیوں کے چاروں فقہی مذاہب کے علماء ایک دوسرے پر کفر کے فتوے صادر کرتے رہے۔ شاید اسی بنا پر بعد میں سر سید احمد خان نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں نے اگر ''تقلید'' کو نہ چھوڑا تو برصغیر میں اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ علامہ اقبال نے 1924ء میں جب ''اجتہاد'' کے موضوع پر اپنا پہلا خطبہ دیا تو اُن پر کفر کے فتوے لگے تھے۔ بعدازاں اسی خطبہ کو بہتر صورت میں خطباتِ ''تشکیلِ نو'' میں شامل کیا گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے ''اجتہادِ مطلق'' پر اصرار کے اسباب کیا تھے؟

علامہ اقبال نے مسلمانوں کے علمی، دینی، سیاسی، تہذیبی، معاشی زوال کی جو وجوہ بیان کی ہیں اُن میں نمایاں تین ہیں: ملوکیت، ملائیت اور خانقاہیت۔ اُن کے خیال میں اسلام کا ''نزول'' اس وقت ہوا جب انسان کی عقلِ ''استقرائی'' بالغ ہو چکی تھی اور اُسے نبیوں، مذہبی پیشواؤں اور بادشاہوں جیسے سہاروں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اسلام نے اعلان کیا کہ نبوت ختم ہو گئی۔ اسلام میں پرانے مذاہب کی مانند کسی قسم کی پاپائیت یا مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں۔ مسلمانوں نے ابتداء ہی میں ساسانی اور رومن سلطنتوں کا خاتمہ کر کے ثابت کر دیا کہ ملوکیت کا تعلق عہد جہلیت سے تھا۔ پس بقول علامہ اقبال اسلام کا پیغام سلطانئ جمہور کا قیام ہے اور یہ کہ اب شعور کی بلوغت کے سبب انسان وحی اور اُس کے احکام کی تعبیر و تشریح خود کر سکتا ہے اور اُس کی بقا اِسی میں ہے کہ کرتا رہے۔

علامہ اقبال ''اجتہاد مطلق'' پر اس لیے بھی زور دیتے ہیں کہ اُن کے مطابق اسلام مسلمانوں کو ''ثبات فی التغیر'' کے اصول پر زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ قرآنی احکام جو عبادات سے متعلق ہیں اُن میں کسی ردوبدل کی گنجائش نہیں، اُنہیں ثبات حاصل ہے لیکن جن احکام کا تعلق ''معاملات'' سے ہے وہ اصول تغیر کے تحت ہیں اور وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق اُن میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اسی سبب علامہ اقبال کی رائے میں ''اجتہاد'' بطور عمل اسلام کی ابتدا ہی کے ساتھ جاری ہو گیا تھا۔ علامہ اقبال ''اجتہاد'' کی تعریف ''اصول حرکت'' کے طور پر کرتے ہیں۔ اسی بنا پر فرماتے ہیں کہ جو اجتہادات ماضی میں کیے گئے وہ اپنے اپنے زمانوں کے مطابق درست تھے۔ مگر وہ حال کی ضروریات کے مطابق صحیح قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ جو کوئی بھی اجتہاد کی تاریخ اور ارتقا کے موضوع پر مستند کتاب لکھنے کا اہل ہو گا وہ اپنے وقت کا مجدّد قرار پائے گا۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ شاید یہ ایک شخص کا کام نہ ہو بلکہ اُسے انجام دینے کے لیے فقہا کا ایک بورڈ قائم کرنا پڑے۔ اور اُس کی تکمیل کے لیے خاصی مدت لگے۔

اگر سوال کیا جائے کہ علامہ اقبال کی سوچ کا ''عطر'' کیا ہے؟ تو اُس کا جواب اُن کے ''جاوید نامہ'' کے اُن چند اشعار سے دیا جا سکتا ہے جب وہ خدائے اسلام کے حضور میں کھڑے ہیں اور خداوند تعالیٰ کے منہ ہی سے کہلواتے ہیں:

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست
از جمالِ ما نصیبِ خود نُبرد
از نخیلِ زندگانی برنخورد

(ہر وہ جو تخلیقی سوچ کی قوت نہیں رکھتا، ہمارے نزدیک اصل کافر اور منافق ہے۔ اُس نے ہمارے جمال میں سے اپنا نصیب حاصل نہیں کیا۔ اور وہ زندگانی کے درخت کا پھل کھانے سے محروم رہا۔)

علامہ اقبال کو اس المیہ کا بخوبی احساس تھا کہ تحریک پاکستان سے پیشتر برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی تحریکیں، یعنی تحریک (وہابی) مجاہدین اور اُس کے بعد تحریک خلافت، جو اسلام کے نام پر چلیں۔ اس لیے ناکام ہوئیں کہ اُن کے پیچھے سوچ ''تقلیدی'' تھی۔ تحریک پاکستان بھی اسلام ہی کے نام پر چلی، لیکن اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی، اس لیے کہ اس کے پیچھے سوچ ''اجتہادی'' تھی۔ علامہ اقبال نے ''علاقائی قومیت'' کے مغربی تصور کو ''اسلامی یا مسلم قومیت'' کے تصور کے طور پر پیش کیا۔ یعنی اگر مشترک علاقہ، زبان یا نسل کی بنیاد پر انسانوں کا گروہ ایک قوم بن سکتا ہے تو مشترک روحانی مطمع نظر کی بنیاد پر مسلمان ایک قوم کیوں نہیں کہلا سکتے؟ 1930ء میں خطبہ الٰہ آباد میں علامہ اقبال نے ''مسلم قومیت'' کے اسی اصول کی بنیاد پر علیحدہ ''ریاست'' کا مطالبہ کیا۔ اُس سے پیشتر 1929ء میں وہ اپنا خطبہ ''اجتہاد بطور اصولِ حرکت'' دے چکے تھے۔ وفات سے چند روز قبل اسی موضوع پر علامہ اقبال کا مناظرہ دیو بند کے مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ ہوا۔ مولانا کا موقف تھا کہ برصغیر کے مسلمان ''قوم'' کے اعتبار سے ہندوستانی ہیں مگر ''ملت'' کے اعتبار سے مسلمان۔ علامہ اقبال نے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک ''قوم وملت'' میں کوئی امتیاز نہیں، دونوں کے ایک ہی معانی ہیں۔ پس بالآخر اسی اجتہادی سوچ کے نتیجہ میں برصغیر کے مسلم اکثریتی صوبوں نے پاکستان کو وجود میں لا کر سیاسی و تہذیبی آزادی حاصل کی۔

اگر پاکستان اجتہادی سوچ کا نتیجہ ہے تو اسلامی قانون سازی کے معاملے میں اجتہادی کے ذریعہ زندہ رہ سکتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ اقبال آئین کے تحت جمہوری طور پر منتخب پارلیمنٹ (اجماع یا شوریٰ) کو اجتہاد کا حق دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک آئندہ کے مجتہد وہ قانونی ماہرین یا وکلاء ہونے چاہئیں جنہوں نے ''اسلامی فقہ'' اور ''جدید جورسپروڈنس'' کے تقابلی مطالعہ کے موضوع پر اعلیٰ تربیت حاصل کی ہو۔ ایسے قانونی ماہرین کسی نہ کسی سیاسی جماعت کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر قانون ساز ادارے یعنی پارلیمنٹ کے رکن بن سکتے ہیں اور اسلامی قانون سازی میں مدد فراہم کر سکتے ہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال حکومت کی۔ اس دوران بادشاہوں نے قلعے بنائے تو اپنی حفاظت کے لیے، محل بنائے تو اپنی عیش وعشرت کے لیے، مقبرے بنائے تو اس لیے کہ یاد رکھے جائیں اور مساجد تعمیر کرائیں تاکہ اللہ تعالیٰ اُن کے گناہ معاف کر دے۔ لیکن نہ کوئی دارالعدل کی عمارت نظر آئیگی نہ دارالعلم کی۔ بادشاہوں کی تاریخ کی کتب سے ہم اتنا جانتے ہیں کہ فیروز تغلق کے زمانہ میں آئین فیروز شاہی لاگو ہوا یا اورنگزیب کے عہد میں فتاویٰ عالمگیری کی روشنی میں انصاف کیا جاتا تھا۔ ایسی کتب موجود نہیں جن سے معلوم ہو سکے کہ اس دوران عدل گستری کے لیے نافذ قوانین کی نوعیت کیا تھی؟ اسی طرح ایسی کتب موجود نہیں جو اس دوران ہمیں اپنی تہذیبی ارتقا کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں۔ یعنی کیا اس مسلم دور کے ہندوستانی مدرسوں نے علم الکلام، فلسفہ یا تجربی علوم میں کوئی اہم یا قابل ذکر ہستیاں پیدا کیں؟ اگر علامہ اقبال قیام پاکستان کے بعد زندہ رہتے تو ایسے سب میدانوں میں تحقیق کی ضرورت پر زور دیتے۔

اب قائداعظم کے نام علامہ اقبال کے خط میں ''فلاحی ریاست کے قرآنی تصور'' کے بارے میں غور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے اس موضوع پر کوئی مستند مقالہ یا خطبہ تو تحریر نہیں کیا۔ شعر ونثر میں چند اشارے موجود ہیں۔ البتہ وہ مارکسزم، کمیونزم یا اشتراکیت کے اتنے ہی خلاف تھے جتنے کیپٹلزم، سرمایہ داری یا جاگیرداری کے۔ اُن کے خیال میں انسانی بہبود یا فلاح کا ہر وہ نظام جو روحانیت سے عاری ہو، انسان کے لیے صحیح سکون و اطمینان کا باعث نہیں بن سکتا۔ شاید اسی بنا پر انہوں نے خطبات میں شامل اپنے خطبہ ''اجتہاد'' میں فرمایا کہ اسلام کا اصل مقصد ''روحانی'' جمہوریت کا قیام ہے۔ علاوہ اس کے پیش گوئی کی تھی کہ سویٹ روس میں کیمونزم بطور نظام ختم ہو جائے گا، جو بالآخر درست ثابت ہوئی۔ مغربی تہذیب کے روحانیت سے عاری سرمایہ دارانہ نظام کے استبداد کے بارے میں بھی وہ سمجھتے تھے کہ شاخ نازک پر بنا یہ آشیانہ ناپائیدار ہوگا۔ علامہ اقبال کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ وہ سرمایہ اور محنت کے درمیان توازن کو اسلامی نظام معیشت قرار دیتے ہوئے اسے ''اقتصاد'' کا نام دیتے ہیں یعنی درمیانہ طبقہ کی فلاحی ریاست۔ بہرحال یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ علامہ اقبال نے ابتدائی زمانہ میں ''پولیٹیکل اکانومی'' پر کتابچہ تحریر کیا اور قیام انگلستان کے دوران ''اکانومکس'' کی کلاسوں میں بھی شریک ہوتے رہے، وہ صحیح معنوں میں تربیت یافتہ اکانومسٹ یا اقتصادیات کے ماہر نہ تھے۔

1926ء میں علامہ اقبال پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ اُس زمانہ میں ''انڈسٹری'' کے میدان میں تو مسلمانوں کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ البتہ ''جاگیرداری'' کا مسئلہ تھا۔ لہٰذا اس موضوع پر کونسل میں اُن کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کو زمین کا مالک سمجھتے تھے۔ یعنی اُن کے نزدیک چار بنیادی عنصر جن سے کائنات تشکیل کی گئی: آگ، پانی، ہوا اور زمین سب خدا کی ملکیت ہیں۔ لہٰذا انسان اصولی طور پر زمین کا مالک نہیں محض ''ٹرسٹی'' ہے تاکہ اُس کے ذریعہ روزی کما سکے۔ اس اصول کا اطلاق وہ ''کراؤن'' یا ''سٹیٹ'' پر بھی کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ''کراؤن'' (سٹیٹ) کے تصرف میں جو اراضی ہے وہ آسان قسطوں پر بے زمین کاشتکاروں میں بانٹ دی جائے۔ نیز جاگیردار کے پاس اتنی اراضی رہنے دی جائے جو وہ خود کاشت کرتا ہو۔ گویا علامہ اقبال جاگیردار کے ''ٹیننٹ'' سے ''بٹائی'' (مخابرہ) لینے کے بھی خلاف تھے۔ اسی طرح اُس زمانہ میں بڑے زمینداروں پر ''ایگریکلچرل'' ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی، جو ٹیکس عشر اور زکوٰۃ کی وصولی کے علاوہ تھا۔ علامہ اقبال مسلم

CS CamScanner

جاگیرداروں پر اسلامی قانونِ وراثت کے سختی کے ساتھ اطلاق سے بھی سمجھتے تھے کہ یوں چند نسلیں گزرنے کے بعد جاگیرداری کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ ان باتوں سے ظاہر ہے کہ علامہ اقبال ''لینڈ ریفارم'' کے بارے میں مخصوص نظریہ رکھتے تھے۔

تاریخی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو مسلم معاشرہ کی معیشت کی بنیادیں دراصل ابتدا ہی سے ''فیوڈل'' (جاگیرداری) نظام پر قائم ہونے کی بجائے ''مرکنٹائیل'' (تجارتی) نظام پر قائم تھیں۔ اسی لیے اسلامی فقہ میں ''مال'' سے مراد ''سرمایہ'' (ویلتھ) بھی ہے اور ''اراضی'' (اسٹیٹ) بھی۔ نیز تجارت کے ذریعہ پیداوار بڑھانا یا منافع کمانا اخلاقی طور پر عمدہ اسلامی خصائل سمجھے جاتے تھے۔ ''تجارتی معیشت'' (مارکیٹ اکانومی) کے لئے ''سرمایہ'' کی فراہمی کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ اِس لئے اگرچہ اسلامی قانون کے مطابق ربوٰ حرام ہے لیکن ایسے لین دین کو مختلف ''حیلوں'' کے ذریعے جاری رکھا گیا۔ بقول ناصر خسرو گیارھویں صدی اصفہان میں ''تبادلۂ سرمایہ'' (منی ایکسچینج) کی خاطر دو سو کے قریب کاروباری ادارے موجود تھے جو یہی کاروبار کرتے تھے۔ علامہ اقبال معاشرہ میں سرمایہ (کیپٹل) کی قوت کو بالکل ختم کرنا نہیں چاہتے بلکہ ''مارکیٹ اکانومی'' کے فروغ کے لیے اُس کی موجودگی کو اہم خیال کرتے ہیں۔ اسی سبب مولانا شبلی کی طرح بینک کے سود کو ''منافع'' قرار دیتے ہیں کیونکہ اس میں استحصال کا ویسا امکان نہیں جو ربوٰ کی وصولی میں ہے۔

پرانے زمانے کی اسلامی ریاست کی آمدنی کے ذرائع مختصراً یہ تھے: ذمیوں سے ''جزیہ'' اور اگر اراضی کے مالک ہوں تو ''خراج'' کی وصولی۔ غنیمہ۔ مسلمانوں سے، اگر اراضی کے مالک ہوں تو ''عشر'' اور اُس کے علاوہ ''زکوٰۃ'' کی وصولی (اگر رضاکارانہ طور پر ادا کی گئی ہو تو) ریاست کو ''تجارتی معیشت'' کے ذریعہ منافع پر مختلف نوعیت کے ٹیکسوں کی آمدنی بھی ہوتی تھی۔ معاشیات کے بارے میں تحریر کرنے والوں میں امام ابویوسف کی ''کتاب الخراج'' معروف ہے۔ مگر ابن خلدون، البیرونی، ابن تیمیہ، ناصر طوسی، ابن مسکویہ اور اخوانِ صفا نے بھی اپنی کتب میں ایسے مسائل پر بحث کی ہے۔

جہاں تک انسان کے بنیادی حقوق کا تعلق ہے، قرآن کی سورۃ طہٰ آیات 118, 119 میں اللہ تعالیٰ آدم سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: ''اے آدم! تمہارے لیے یہاں انتظام ہے۔ نہ بھوکے ننگے رہو گے نہ گرمی تمہیں ستائے گی۔'' ان آیات کے ساتھ اگر ترمذی کی بیان کردہ حدیث پڑھی جائے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد کیا: ''آدم کے بیٹے کے تین حقوق ہیں، رہنے کو مکان، ننگا پن چھپانے کو کپڑا اور کھانے پینے کو روٹی اور پانی۔ تو اسلامی فلاحی ریاست کے ارباب بست وکشاد پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ہر شہری کو یہ سہولتیں فراہم کریں۔ اور اب تو اُن میں دو مزید حقوق یعنی بلا معاوضہ تعلیم اور مفت طبی امداد کا اضافہ ہوگیا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ علامہ اقبال خاندانی منصوبہ بندی کے اِس طرح قائل تھے کہ اگر بیوی اولاد پیدا نہ کرنا چاہے تو خاوند اسے مجبور نہیں کرسکتا۔

علامہ اقبال جب قائداعظم کو اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ اسلامی قانون کے طویل مطالعہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کی ''جدید نظریات'' کی روشنی میں ارتقا کے ذریعے قابل قبول ''سوشل ڈیماکریسی'' قائم کی جاسکتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے: وہ اپنے اس دعویٰ کی بنیاد کن قرآنی آیات پر استوار کرتے ہیں؟ عین ممکن ہے انہوں نے فلاحی ریاست کے قرآنی تصور کی بنیاد سورۃ البقرہ آیت 219 اور سورۃ الذریات آیت 19 پر رکھی ہو۔ سورۃ البقرہ آیت 219 میں حکم ہے: ''پوچھتے ہیں اللہ کی راہ میں کیا خرچ کیا جائے؟ قل العفو (کہو جو ضرورت سے زائد ہے)!!'' اس ضمن میں علامہ اقبال کے اشعار قابل غور ہیں۔

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ ''قل العفو'' میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

''قل العفو'' کے بارے میں ''تقلیدی'' سوچ تو یہی ہے کہ انسان رضاکارانہ طور پر جو اپنی ضرورت سے زائد یا فالتو سمجھے خدا کی راہ میں دیدے۔ مگر ''جدت کردار'' سے علامہ اقبال کی کیا مراد ہے؟ کیا یہ طے کرنے کے لیے کہ ضرورت سے زائد یا فالتو کیا ہے، ریاست کی مداخلت ضروری ہے؟ سورۃ الذریات آیت 19 میں ارشاد ہوتا ہے ''دولت مندوں کے مال میں ناداروں اور محروموں کا حصہ ہے'' کیا علامہ اقبال کے نزدیک اس حصہ کا تعین کرنے کی خاطر بھی ریاست کی مداخلت ضروری ہے؟ علامہ اقبال کے ارشادات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے بنیادی حقوق کے قرآنی تصور اور دولت مندوں کی ذمہ داری سے متعلق قرآنی احکام کے تحت ''روحانی'' بنیادوں پر قائم ''سوشل ڈیمارکریسی'' یا ''اسلامی فلاحی ریاست'' وجود میں لائی جاسکتی ہے۔

بہرحال خصوصی طور پر ''اجتہاد کی تاریخ وارتقا'' اور ''فلاحی ریاست کا قرآنی تصور'' کے موضوعات پر کتب تحریر کرنا ایسے کام تھے جو علامہ اقبال تو ادھورے چھوڑ گئے مگر علامہ اقبال کے نام پر قائم سرکاری یا غیر سرکاری ادارے انجام دے سکتے ہیں یہی امید ہمیں اس ادارے سے رکھنی چاہئے جو میاں اقبال صلاح الدین اور اُن کے رفقاء نے علامہ اقبال کے نام پر قائم کیا ہے۔ شاید ''اجتہاد کی تاریخ وارتقا'' پر کوئی مستند کتاب تحریر کرنے کی خاطر علماء وفقہا کا بورڈ قائم کرنے کی ضرورت پڑے۔ اسی طرح ''فلاحی ریاست کا قرآنی تصور'' کے موضوع پر کچھ تحریر کرنے کی خاطر ماہرین اقتصادیات کی خدمات حاصل کرنی پڑیں۔ علامہ اقبال احیائے اسلام کے شاعر ہیں۔ انہوں نے فرما رکھا ہے کہ وہ ''حرفِ آخر'' نہیں۔ اگر اُن کا شروع کردہ عمل احیاء واقعی جاری ہے تو بقول اُن کے، اُن کے پیش کردہ نظریات سے بہتر نظریات سامنے آسکتے ہیں۔ ضرورت صرف ان کے اس شعر کو ملحوظ خاطر رکھنے کی ہے ۔

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست

پاکستانی ادب کا مسئلہ

ڈاکٹر انور محمود خالد

ادب، کسی مخصوص خطۂ زمین یا قوم کا جذباتی، فکری اور نفسیاتی احوال نامہ ہے۔ یہ بیک وقت جگ بیتی بھی ہے اور آپ بیتی بھی۔ یہ مقامی ہوتے ہوئے بھی آفاقی اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ ادب، خلا میں جنم نہیں لیتا، بلکہ اسے اپنی تخلیق، ترسیل، فروغ اور ارتقا کے لیے سوچنے سمجھنے والے انسانوں کے ایک گروہ کی ضرورت ہے، ادب، ادیب کے آدرشی تصورات کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد، ماحول اور معاشرت کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے۔ ادب ظلمت سے نور اور شر سے خیر کشید کرتا ہے۔ ادیب کا ذہن وہ خط اُفق ہے، جہاں زمین و آسمان کی حدیں باہم پیوست ہو جاتی ہیں۔

اُردو ادب، برصغیر پاک و ہند کی اسلامی تہذیب، مسلمانوں کی حریتِ فکر اور احساسِ ملّی کا مظہرِ عظیم ہے۔ پچھلی ڈیڑھ صدی کی تہذیبی مسافت میں مسلمان ادیبوں کے پہلو بہ پہلو غیر مسلم ادیب بھی رواں دواں نظر آتے ہیں اور اُن کی فنی کاوشیں یقیناً اُردو شعر و ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، لیکن اولاً اُن کی تعداد اپنے مسلمان معاصرین کے مقابلے میں بے حد کم ہے اور ثانیاً وہ بھی برصغیر کی مسلم تہذیب کے اثرات سے اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزارِ نسیم''، رتن ناتھ سرشار کے ناول، پریم چند اور کرشن چندر کی افسانوی تحریریں اور فراق گورکھ پوری کی غزل، غیر منقسم ہندوستان کے اُس مخلوط کلچر کی نمائندہ ہیں، جس پر مسلمانوں نے اپنے گہرے اثرات چھوڑے۔ حقیقتاً اُردو ادب کو مسلمان علماء، ادباء اور شعراء کے اُس انبوہِ عظیم نے مالا مال کیا ہے جس کی فکری کاوشیں، قومی اَنا اور عصری زندگی کے دوسروں کو ملانے کی سعیٔ پیہم ہیں۔ مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا دینی سرمایہ، اورنگ زیب عالمگیرؒ اور ٹیپو سلطان کی اسلامی، فلاحی ریاستیں قائم کرنے کی کوششیں، سرسیّد، حالی، شبلی، نذیر احمد، محمد علی جوہر، سیّد سلیمان ندوی اور ابوالکلام آزاد کا علمی و ادبی ورثہ، غالب، اکبرالہ آبادی، ظفر علی خاں، حسرت موہانی اور علامہ اقبال کی شاعری اور تحریکِ پاکستان کے قافلہ سالار، قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کی رہنمائی میں، ملتِ اسلامیہ کو ایک قوم بنانے کے لیے مسلم لیگ کی کامیاب سیاسی جدوجہد۔۔۔ یہ سب ہمارے ماضی کی فکری تاریخ اور قومی شعور کے وہ ابوابِ منوّر ہیں، جن کے ذریعے ہم مسلمانوں کو اپنے گم شدہ وجود کا سراغ ملا۔

علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد میں ہندوستان میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے واضح لفظوں میں اس حقیقت کا اظہار کیا کہ:

''میں دوسری قوموں کے رسوم و آئین اور اُن کے معاشرتی اور مذہبی اداروں کی دِل سے عزت کرتا ہوں، بایں ہمہ مجھے اس جماعت سے دِلی لگاؤ ہے، جو میرے اوضاع و اطوار اور میری زندگی کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب، اپنی حکمت اور اپنی تہذیب سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا، جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سرِ نو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرم کار ہے۔''

۱۹۳۰ء میں برصغیر کے عظیم اسلامی شاعر نے جس مملکت کا خواب دیکھا تھا، وہ ٹھیک سترہ برس بعد دُنیا کے نقشے پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام سے نمودار ہوئی، لیکن ہماری ادبی تاریخ کا یہ ایک المناک پہلو ہے کہ اِس دوران میں اُردو ادب کی دونوں جدید تحریکیں (ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کی ادبی تحریک) اُس ولولہ انگیز جدوجہد کی ترجمانی کرنے سے قاصر رہیں، جو غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں نے مسلم لیگ کے پرچم تلے کی۔ ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں نے اگرچہ ترقی پسندی اور مارکسیت کو لازم و ملزوم قرار نہیں دیا تھا، لیکن اس اَمر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس تحریک سے وابستہ بیشتر ادیب، نقاد اور شاعر، اشتراکیت سے متاثر تھے اور اسی کی فکر پر اپنی تخلیقات کی بنیاد رکھتے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے بعض ادیب، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رُکن بھی تھے اور اس پارٹی نے قومی تحریکوں کی ہر موقع پر مخالفت کی۔ تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، سول نافرمانی کی تحریک اور ہندوستان چھوڑ دو تحریک، کے خلاف اُن کا ردِّ عمل کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ترقی پسند ادیبوں میں سے وہ افراد بھی، جو اشتراکی پارٹی کے رُکن نہیں تھے، آزادیٔ ہند کے مطالبہ کو جاگیر دار طبقہ کا مطالبہ کہہ کر اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ حلقۂ اربابِ ذوق سے منسلک ادباء اپنی تخلیقات میں سیاست سے اس طرح بھاگتے تھے، جیسے سگ گزیدہ، پانی سے۔ نتیجتاً انھیں بھی قومی سیاسی تحریک سے کوئی ہمدردی پیدا نہ ہوئی۔ یہ کتنا بڑا ادبی سانحہ ہے کہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصہ میں، جب آل انڈیا کانگرس، متحدہ ہندوستانی قومیّت اور مسلم لیگ، دو قومی نظریے کی گونج میں غیر ملکی حکمرانوں سے نجات پانے کی جدوجہد میں مصروف تھیں، اُردو کے اکثر ترقی پسند اور غیر ترقی پسند ادباء، وقت کی اس فیصلہ کُن گھڑی میں ہندوستانیوں کے افلاس، بھوک،

CamScanner

بیماری، جہالت، جنسی محرومیوں، نفسیاتی اُلجھنوں اور مذہب بیزاری کو موضوعِ فن بنا کر اپنا ڈھول الگ پیٹ رہے تھے۔ حصولِ آزادی کی کوہ پیکر موج، اُن کے سروں پر سے گزر گئی، لیکن انھیں اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر کی تقسیم ہوئی تو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اپنی مخصوص حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے بعض ایسے اشتراکیوں کو پاکستان بھیجا، جو خود کو مسلمان کہتے تھے اور بدلے ہوئے حالات میں اشتراکیت کے لیے زمین ہموار کر سکتے تھے۔ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا اور مشہور ترقی پسند ادیب سیّد سجاد ظہیر اس کے سیکرٹری بن کر یہاں تشریف لائے۔ کمیونسٹ پارٹی کو انجمن ترقی پسند مصنّفین پاکستان کے اُن اراکین کی طرف سے خاص طور پر کمک ملی، جو کھلم کھلا اشتراکیت کو اپنا نصب العین، اور رُوس کو اپنے خوابوں کی جنت قرار دیتے تھے۔ بجائے اس کے کہ پاکستانی ترقی پسند ادیب آنکھیں کھول کر تازہ حقائق کا سامنا کرتے اور اِس مملکت کی تعمیر اُن اسلامی معاشرتی اقدار کی روشنی میں کرتے، جو نظریۂ پاکستان کا سنگِ بنیاد تھیں، انھوں نے روزِ اوّل سے ہی اِس زندہ حقیقت کی مخالفت کو اپنا شعار بنالیا۔ فیض احمد فیضؔ نے ''صبحِ آزادی'' (۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء) کے عنوان سے جو نظم لکھی، اس میں مسلمانانِ ہند کے خوابوں کی حسین ترین تعبیر کو ''داغ داغ اُجالا'' اور ''شب گزیدہ سحر'' قرار دیا اور احمد ریاضؔ نے سرحد پار کے اپنے نظریاتی ہم سفروں کو یہ کہہ کر آواز دی کہ

ساتھیو، ہاتھ بڑھاؤ کہ ہیں ہم آج بھی ایک
کون کر سکتا ہے تقسیم ادب کی جاگیر؟
شہر بٹ سکتے ہیں، ہو سکتی ہیں گلیاں محدود
کون کر سکتا ہے احساس کی شدت کو اسیر؟

ممتاز حسین، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، عارف عبدالمتین، فارغ بخاری، احمد راہی اور ان کے ہم خیال اشتراکی ادیبوں نے قیامِ پاکستان کو اپنی نظریاتی شکست سمجھتے ہوئے برسرِ اقتدار طبقے کی مخالفت کی آڑ میں تشکیلِ پاکستان کے محرکات کی مخالفت کرنا شروع کر دی۔ نومبر ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے پہلے اجلاس میں جو مولانا چراغ حسن حسرتؔ کی زیرِ صدارت ہوا، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ظہیر کاشمیری، ممتاز حسین، احمد ندیم قاسمی اور عارف عبدالمتین نے علی الاعلان اشتراکی حقیقت پسندی کو اپنی فکری اساس قرار دیا اور اشتراکی نظام کو اُس وقت کی سیاسی کشمکش کا واحد حل بتایا۔ انھوں نے پاکستان میں اشتراکی انقلاب کا نعرہ لگایا اور اپنی صفوں میں موجود صرف ایسے ادیبوں اور شاعروں کے نقطۂ نظر کو درست قرار دیا جو اس نصب العین کے حصول کے لیے اپنی ادبی اور شعری صلاحیتیں وقف کر سکتے تھے۔ جن ادیبوں نے اُن کی ہاں میں ہاں ملانے سے انکار کر دیا اور قومی ادب، پاکستانی ادب یا اسلامی ادب تخلیق کرنے پر زور دیا، انھیں بے ضمیر، رجعت پسند، حکمرانوں کے خوشامدی اور بیمار نظریوں کے پرچارک قرار دیا گیا۔ عارف عبدالمتین، اس دور میں لکھے ہوئے اپنے ایک مضمون ''پاکستان کے شعری رجحانات'' (مطبوعہ ''سویرا لاہور'' شمارہ نمبر ۷۔۸) میں ایسے تمام شعرا کی خبر لیتے ہیں، جو پاکستان کی محبت میں سرشار ہو کر اس کی عظمت کے گیت گاتے ہیں اور اپنی نظموں اور ترانوں میں خدا، رسول ﷺ اور اسلام کا نام لیتے ہیں۔ چنانچہ پہلے تو وہ محمد حسن عسکری پر یہ کہہ کر طنز کے تیر برساتے ہیں کہ

''محمد حسن عسکری، جو اس وقت پاکستان میں نام نہاد قومی اور اسلامی ادب کے حامیوں کے امام ہیں ''ساقی'' میں پاکستانی ادیبوں کو قوم کی مجموعی زندگی سے تعلق پیدا کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''ہماری ہیئت اجتماعی میں ادب کی حیثیت کیا ہے؟ اس کا فریضہ اور منتہا کیا ہے؟'' مگر ان سوالات کے خود ساختہ جوابات تحریر کرنے سے پیشتر ہی اُن کی آنکھوں کے سامنے اپنے گزشتہ فرمودات اُبھر آتے ہیں، جن میں وہ ایسے مسائل کو سرے سے ہی جھٹلاتے آئے ہیں۔۔۔ کیا آپ نے ان الفاظ میں مجرم ضمیر کی گونج محسوس نہیں کی؟''۔۔۔ اس کے بعد وہ ان تمام ادیبوں کو سماجی مجرم قرار دیتے ہیں، جو پاکستانی قومیت سے ادیبوں کی وفاداری کا سوال اُٹھا رہے تھے اور جو پاکستانی عوام کو اُن کی صحیح آزادی کی قدر و قیمت کا احساس دِلا رہے تھے۔ عارف عبدالمتین کے درج ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں:

''پاکستان میں ایسے سماجی مجرموں کی کمی نہیں۔ صمد شاہین، ممتاز شیریں، عزیز احمد، محمد دین تاثیر اور دوسرے نثر نگاروں سے قطع نظر، تقریباً سبھی رجعت پسند شعرا میں یہ نظریاتی تضاد بڑا نمایاں ہے۔ مثلاً یوسف ظفر، قیوم نظر، سیف الدین سیف، عشرت رحمانی، تابش صدیقی وغیرہ (میں ماہر القادری، سیماب اکبر آبادی اور امیں حزیں جیسے شعرا کا ذکر نہیں کروں گا، کیونکہ انھوں نے زندگی کی مردہ قدروں کی محافظت کا فریضہ اتنی عمر تک سرانجام دیا ہے کہ غالباً اُن کی اپنی نگاہوں میں اُن کی کوئی توقیر باقی نہیں رہی۔)

اِس خود ساختہ ''تضادِ فکری'' کی مثالیں دیتے وقت وہ سب سے پہلے سیف الدین سیفؔ کو لتاڑتے ہیں، جو اُن کے خیال میں پاکستان کی آزادی کے نغمے الاپنے والوں میں بڑے پیش پیش ہیں۔ انھیں سیف کے اِن شعروں پر بہت تاؤ آیا ہے۔

ہر سو نئی سحر کے اُجالے بکھر گئے
ایک جنبشِ صبا سے شگوفے سنور گئے
ہم نے اِسی سحر کے لیے سر کٹائے ہیں
ہم نے اِسی زمیں کے لیے گھر جلائے ہیں

CS CamScanner

یہ اشعار نقل کرنے کے بعد بڑے طنزیہ انداز میں ارشاد فرماتے ہیں:

”پاکستان کا کتنا خوبصورت نقشہ کھینچا گیا ہے۔ کیا آپ کو اب بھی پاکستان کے جنت الفردوس ہونے میں کوئی شک ہے؟“

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں ”ان رجعت پرست شعرا نے جہاں پندرہ اگست کے سیاسی شعبدے پر حقیقی آزادی کا خول چڑھا کر عوام کی جنگِ حریت کو مدھم کرنے کی ناپاک کوشش کی، وہاں ذی اقتدار طبقہ کے مفادات کو مزید مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اس کے تمام غیر ترقی پسند نعروں کو ادب میں ہوا دی۔ وطنی تعصب کو اُبھارنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے اور مذہبی عصبیت کو بیدار رکھنے میں دِن رات کوشاں رہے۔“ پھر عشرت رحمانی، یوسف ظفر اور عبدالمجید بھٹی کو نشانہ تضحیک بناتے ہیں، کیوں کہ انھوں نے پاکستان کے گن گا کر، بقول اُن کے ”حکومت پاکستان کی نمک خواری کا حق ادا کیا ہے، اندرونی لٹیروں کی حلقہ بگوشی اختیار کی ہے اور مذہبی نعرہ بازی سے کام لیا ہے۔“ ۔۔۔ لیکن ظہیر کاشمیری، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، حسن طاہر، احمد راہی، احمد ندیم قاسمی، ابنِ انشاء، عابد حشری اور قمر اجنالوی وغیرہ شعرا کی تعریف کرتے ہیں، کیونکہ انھوں نے پاکستان کی بجائے، بقول اُن کے ”چین، برما، ویت نام، انڈونیشیا وغیرہ کی انقلابی تحریکات کی توصیف میں جو نظمیں لکھیں اور (مذکورہ بالا نظموں میں) جس طرح سمرقند و بخارا میں مروّجہ رُوسی اشتراکی نظام کی حمایت کی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ طبقاتی شعور اور بین الاقوامی سیاست کی حقیقی سوجھ بوجھ نے ہماری غیر جانب داری کو قطعاً ختم کر دیا ہے، اور ہمارے ترقی پسند فن کار اعلانیہ طور پر عوام دوست ممالک کا ساتھ دینے لگے ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے ادب، ہماری تحریک اور ہمارے مشن کے لیے نہایت نیک فال ہے۔“

اِسی مضمون میں انھوں نے ن۔م۔ راشد، انجم رومانی، قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی اور خاطر غزنوی وغیرہ کو بھی اُن کے بعض فکری رجحانات کی بنا پر رگیدا ہے۔ ن۔م۔ راشد اور انجم رومانی سے انھیں یہ شکایت ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں سوویٔت روس اور اس کے انقلابی نظریات کی تضحیک کی ہے اور قتیل شفائی کو اُن کی نظم ”کربلا“ پر ٹوکا ہے، جو اُن کی نظر میں خطرناک احیائی میلانات کی حامل ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی ایک نظم ”کشمیری مجاہد کا نعرہ“ کے ان اشعار پر بھی انھیں اعتراض ہے:

مَیں گرزِ مصطفویؐ سے بتوں کو توڑوں گا
مَیں اپنا رشتہ شہِ غزنوی سے جوڑوں گا
مری خودی کو کسی نے جو ٹھیس پہنچائی
اُفق کے پار بھی پیچھا نہ اُس کا چھوڑوں گا
مری نظر میں مدینہ کی سرزمیں ہے ابھی
محمدؐ عربی پر مجھے یقیں ہے ابھی

عارف عبدالمتین کی رائے میں ”اِن اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر نے کشمیر کو اپنی ریاست کے حکمران طبقے کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ اُس کے ذہن میں کشمیر کے ہندو، مسلمان، ڈوگرے، سکھ، سبھی عوام موجود نہیں بلکہ عوام کا ایک حصہ، ایک فرقہ، جو مذہباً مسلمان ہے۔ اپنے حکمران طبقے سے یہ اندازِ نظر مستعار لینے سے تمام نظم خطرناک قسم کے احیائی میلانات سے اس قدر لبریز ہو گئی ہے کہ اگر احمد ندیم قاسمی کی دوسری ترقی پسند نظمیں ہماری نظر سے نہ گزری ہوتیں اور خود احمد ندیم کو ہم اچھی طرح نہ جانتے ہوتے تو ہمارے لیے اُن میں اور یوسف ظفر یا عشرت رحمانی میں فرق کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہو جاتا۔“

اِس کے علاوہ عارف عبدالمتین کو اس بات کا بھی رنج ہے کہ پاکستان کے بعض شعرا نے قائداعظم کی وفات پر اُنھیں اپنا ہیرو تصور کرتے ہوئے منظوم ہدیۂ عقیدت کیوں پیش کیا اور اُن کے سوگ میں مرثیے کیوں لکھے؟ ذرا اُن کے یہ سفاکانہ جملے ملاحظہ ہوں:

”طبقاتی شعور کو ڈھیلا چھوڑنے اور بورژوا اور فیوڈل طبقے کے وسیع پراپیگنڈے سے متاثر ہونے کا ایک افسوس ناک نتیجہ پچھلے دو سالوں میں یہ بھی رُونما ہوا کہ ہمارے کئی شعرا نے اُن رہنماؤں کو اپنا ہیرو قرار دیا، اور اُن کی موت پر مرثیے لکھے، جنھیں مستقبل کا عوامی مؤرخ، عوام دُشمنی کے سنگین جرم کے لیے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ اِس سلسلہ میں احمد ندیم، قتیل شفائی، خاطر غزنوی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔“

گویا ”غروبِ عظمت“ کے عنوان سے گاندھی جی کے مرثیے لکھنے تو جائز تھے اور اِس ہندو رہنما کے قتل پر لکھے گئے مرثیوں کے لیے مجلّہ ”سویرا“ لاہور کی ایک اشاعت میں، ایک گوشہ مخصوص کرنا بھی ترقی پسندی کا مظاہرہ تھا، لیکن بانیٔ پاکستان کی وفات پر کسی پاکستانی شاعر کا کوئی تعزیتی نظم لکھنا طبقاتی شعور سے بے بہرہ ہونے کی دلیل تھا۔ سانحہ یہ ہے کہ اِس قسم کے خیالات کا اظہار پاکستان میں بیٹھ کر وہ ادیب کر رہے تھے، جو اپنے زعم میں غیر صحت مند اور فسطائی رجحانات کے خلاف بہادرانہ جدوجہد کے نقیب بنے ہوئے تھے اور اپنے سوا کسی اور ادیب کو پاکستان کا خیر خواہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ پہلی کُل پاکستان ترقی پسند مصنّفین کانفرنس میں جو منشور پیش کیا گیا (اور جو ”سویرا“ کے شمارہ نمبر ۷۔۸ میں شائع ہو چکا ہے۔) اُس میں بھی پاکستان کے ادیبوں کو دو بڑے گروہوں میں منقسم دکھایا گیا ہے اور قیامِ پاکستان کے بعد کے زمانے کو ایک نئی جنگِ آزادی کے حصول کا دور قرار دیا گیا ہے۔ اِس منشور کی یہ سطور ملاحظہ ہوں:

''جنگِ آزادی کے اس نئے دور میں ہمارے ادب میں بھی دو رجحانات صاف دِکھائی دے رہے ہیں۔ ایک طرف وہ ادیب اور فن کار ہیں، جو پاکستان کے حکمران گروہ کے ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں جو سچی آزادی، امن، جمہوریت اور اشتراکیت کے لیے جدوجہد کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں۔۔۔ دوسری طرف وہ ادیب ہیں، جو حکمران طبقے کے اغراض و مقاصد کی ترجمانی کرتے ہیں، اس کے ظلم و تشدد کو سراہتے ہیں، یا اس پر پردہ ڈالتے ہیں، جمہوری خیالات اور جمہوری تحریکوں کی مخالفت کرتے ہیں۔۔۔ اور اپنی تحریروں سے لوگوں میں پست ہمتی، بے عملی اور ذہنی اُلجھاؤ پیدا کرتے ہیں۔''

رہے تیسری قسم کے ادیب، جو خود کو مخصوص سیاسی گروہ بندیوں سے الگ کر کے صرف اچھا ادب تخلیق کرنے کے داعی تھے، اُن کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

''جو ادیب اِن دونوں متصادم ادبی صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر تیسرا گروہ بنانا چاہتے ہیں، یا غیر جانب داری کا دعویٰ کرتے ہیں یا ان دونوں گروہوں میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ دراصل عوام کو دھوکا دیتے ہیں، رجعت پرست ادیبوں کی عوام دُشمنی اور اپنی بزدلی اور مکاری کو چھپانا چاہتے ہیں۔ عوام کے دُشمن ادیبوں کے ساتھ، یعنی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے نقارچی ادیبوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔''

اسی منشور میں پاکستان کے غیر ترقی پسند ادیبوں کو (یعنی جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے رُکن نہیں تھے) بلا استثنا رجعت پسند قرار دیا گیا ہے اور انھیں مزید کئی گروہوں میں تقسیم کر کے اُن کے خیالات کی الگ الگ مذمت کی گئی ہے۔ ''ادب برائے ادب'' کا نعرہ لگانے والوں اور فرائڈ اور دوسرے ماہرینِ نفسیات سے متاثر ادیبوں کی اسلوب پرستی اور انفرادیت پسندی، جنسیت، فحش نگاری اور نفسیاتی موشگافیوں کے بخیے اُدھیڑنے کے بعد، اُن ادیبوں کو بطورِ خاص آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے، جو ''پاکستانی ادب'' اور ''اسلامی ادب'' کا نام لیتے تھے۔ منشور کے یہ فقرے قابلِ غور ہیں:

''دوسرا گروہ اُن نام نہاد ''پاکستانی ادیبوں'' کا ہے، جو اپنی تحریروں میں انتہائی گھناؤنی اور زہریلی قسم کی وطن پرستی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ دراصل انھیں پاکستان سے محبت ہی نہیں۔ جب وہ ''پاکستانی ادب'' کا نعرہ لگاتے ہیں، تو اُن کی مراد اُس ادب سے نہیں ہوتی، جس میں پاکستان کے پچانوے فیصدی عوام کی کلفتوں اور خواہشوں کا تذکرہ ہو، بلکہ اُن کی مراد اُس ادب سے ہوتی ہے، جس میں پاکستان کے برسرِ اقتدار طبقے کی نام نہاد قومی خدمات کو سراہا گیا ہو، یعنی اُن کے ظلم و تشدد پر پردہ ڈالا گیا ہو۔ جب یہ فاشسٹ ذہنیت رکھنے والے ادیب پاکستان سے وفاداری کا دعویٰ کرتے ہیں، تو اُن کا مطلب ہوتا ہے، پاکستان کے سرمایہ داروں، جاگیرداروں، نوابوں اور دوسرے جمہوریت دُشمن عناصر سے وفاداری۔۔۔ نہ کہ پاکستان کے محنت کشوں سے، اور اُن کی جدوجہد سے وفاداری۔۔۔ یہ ادیب ہمارے دُشمن ہیں، کیونکہ وہ پاکستان کے محنت کشوں کے جذبۂ حب الوطنی کو، برسرِ اقتدار طبقے کی خودغرض سیاست کی خاطر استعمال کرتے ہیں۔

تیسرا گروہ اُن ادیبوں کا ہے، جو ''اسلامی انقلاب'' کے نام پر رجعت پرستی کا پرچار کرتے ہیں۔ دراصل اِن ادیبوں کو اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں، انھیں انسان کی رُوحانی قدروں سے اور اخلاقی اصولوں سے بھی کوئی لگاؤ نہیں۔۔۔ یہ رجعت پرست ادیب لوگوں کے مذہبی جذبات سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جو کام پاکستان کے سرمایہ دار حکمران اِن دِنوں اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کے نعروں سے لیتے ہیں، وہ کام اُن کے نقارچی، نام نہاد ''اسلامی ادب'' سے لینا چاہتے ہیں۔ یعنی اسلام کی آڑ لے کر سرمایہ داری نظام کی خرابیوں پر پردہ ڈالنا اور جو کچھ یہاں ہو رہا ہے، لوگوں کو یہ باور کرانا کہ وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے۔ یہ ادیب ایسے رجعت پرست تصورات کی تلقین کرتے ہیں، جن سے لوگوں میں ذہنی اُلجھن پیدا ہو اور اُن کا دھیان آج کل کے اصلی اور بنیادی مسئلوں کی طرف سے ہٹ جائے۔ مثلاً لوگوں کو صبر و شکر اور قناعت و توکل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ فقر و فاقہ کے رُوحانی فائدے بیان کیے جاتے ہیں۔ قلندری اور درویشی کی فضیلت ثابت کی جاتی ہے۔ مادی ضرورتوں سے مستغنی ہو کر رُوحانی ترقی کی باتیں کی جاتی ہیں۔ سائنس اور سائنٹفک طرزِ فکر کی مخالفت کی جاتی ہے۔ عقل کو عیار بتایا جاتا ہے۔ اِس سے ہماری جمہوری تحریک اور حالات کو بہتر بنانے کی عوامی جدوجہد کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ہم اس کے خلاف پوری مستعدی سے جدوجہد کریں گے۔''

آگے چل کر کہا گیا ہے کہ:

''ہمارے دُشمن ہم پر جانبداری کا الزام لگاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، تمھاری تحریروں میں سیاسی رجحان پایا جاتا ہے۔ ہمیں اِس کا اعتراف ہے۔ ہم حیات اور موت کی جنگ میں جانبدار ضرور ہیں۔ ہماری تحریروں میں جمہوری رجحان پایا جاتا ہے اور ہم سچائی کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات پر فخر ہے کیونکہ ہماری اِس جانبداری، اِس رجحان، اِس پروپیگنڈہ کا مقصد، محنت کشوں کو آزاد کرانا ہے، بنی نوع انسان کو سرمایہ داری اور جاگیرداری کی غلامی کی لعنت سے نجات دلانا ہے، ایک غیر طبقاتی متمدن سماج کی تعمیر

CS CamScanner

کرنا ہے۔ ادب کا اِس سے بہتر استعمال، اِس سے اعلیٰ مقصد اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

اور اختتام اِن جملوں پر کیا گیا ہے:

"آج کے انقلابی دَور میں عظیم ادب صرف محنت کشوں کی جدوجہد میں حصہ لے کر، اُن کی اُمنگوں اور تقاضوں کو اپنا کر، اور اُن کی ترجمانی کر کے پیدا ہو سکتا ہے۔ آج انسان سے محبت کرنے کا اور اس کے آرٹ اور تہذیب کا تقاضا ہے کہ ہم ادیب، پاکستان کے محنت کشوں کی روزانہ کی جدوجہد میں، پاکستان کے سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کو توڑ کر اس کی جگہ عوامی جمہوری نظام قائم کرنے کی جدوجہد میں، پوری طرح شریک ہوں تاکہ ہمارا ملک بھی جلد از جلد آزاد انسانوں کا ملک بن سکے۔"

یوں انجمن ترقی پسند مصنفین نے کیمونسٹ پارٹی کے اراکین کی ہم نوائی میں پاکستان میں اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لیے کام کرنا شروع کیا اور اس مقصد کے لیے باقاعدہ نظمیں اور مضامین لکھنے کی مہم چلائی۔ صرف اشتراکی ادب کو پاکستانی ادب قرار دیا گیا اور اس کے فروغ کے لیے "سویرا"، "ادبِ لطیف" اور "نقوش" جیسے ادبی رسالوں اور روزنامہ "امروز" کے ادبی ایڈیشنوں کو استعمال کیا گیا۔ یوں تھوڑی سی مدّت میں وہ راگ جو پہلے فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، سیّد سبطِ حسن، ظہیر بابر، صفدر میر، عارف عبدالمتین، ظہور نظر، ظہیر کاشمیری اور احمد راہی جیسے صفِ اوّل کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے ہونٹوں سے پھوٹتا تھا، اب نئی پود کا کم و بیش ہر فرد اُسے اپنے اپنے سُروں میں الاپ رہا تھا۔ اُن سب کے لیے مثالی ادب وہ تھا جو روس کی منڈی سے درآمد کیا گیا تھا۔ اُن کا ادبی رہنما، اقبال کی بجائے گورکی تھا اور عظیم باپ، قائداعظم کی بجائے مارکس، لینن اور سٹالن۔

سیّد سجاد ظہیر نے جو ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ کیمونسٹ پارٹی کے سیکرٹری بھی تھے، ہندوستان سے پاکستان تشریف لاتے ہی اپنے ایک بیان میں پاکستانیوں کو یہ سنہری مشورہ دیا کہ وہ حیدرآباد دکن اور کشمیر کی ریاستوں سے دست بردار ہو جائیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر بعض ادیبوں کی ملّی غیرت جوش میں آئی اور انھوں نے ذاتی تعلقات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اِس زیادتی کے خلاف احتجاج کیا۔ ڈاکٹر محمد دِین تاثیر، محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور صمد شاہین جیسے محبِ وطن ادیبوں پر عارف عبدالمتین کا غم و غصہ بے جا نہ تھا، کیونکہ انھیں ادیبوں نے پاکستان کے ساتھ رشتۂ اُلفت استوار کرنے اور پاکستانی عوام کی قومی اُمنگوں کی ترجمانی کرنے کے لیے "پاکستانی ادب" تخلیق کرنے پر زور دیا تھا۔ اب کراچی کا "نیا دور" اِس نئے آئیڈیل کا نقیب بنا۔ مذکورہ بالا ادیبوں نے اشتراکی ادیبوں کی حب الوطنی کی آزمائش کے لیے سب سے پہلے پاکستانی ریاست کے ساتھ وفاداری کا سوال اُٹھایا۔ روس چونکہ مسئلہ کشمیر کے معاملے میں پاکستانی مؤقف کا مخالف تھا اور ترقی پسند ادیب تمام سیاسی مسائل کے سلسلے میں اُسے اپنا قبلہ سمجھتے تھے، اِس لیے جب ڈاکٹر تاثیر نے ایک قرارداد تیار کر کے پاکستان کے تمام ادیبوں کو توثیق کے لیے ارسال کی، جس میں کشمیر کی جنگ میں حکومت کی تائید کرنے اور پاکستانی قومیت سے اپنی وابستگی کا اعلان کرنے کے لیے کہا گیا تھا، تو ترقی پسندوں نے یہ کہہ کر کہ یہ ہماری فکری آزادی پر حملہ ہے، اس کا جواب تک دینے سے اِنکار کر دیا۔ پاکستان سے وفاداری کے مسئلے پر محمد حسن عسکری کے ایک مضمون کے جواب میں ظہیر کاشمیری نے "سویرا" میں اپنے ہم سفروں کے مؤقف کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا:

"وہ (محمد حسن عسکری) یہ نہ سمجھا سکا کہ پاکستان سے اُس کی مراد کیا ہے؟ اور وفاداری کے سیاسی معنی کیا ہو سکتے ہیں؟ اگر پاکستان سے عسکری کی مراد محض ایک خطۂ زمین ہے، تو اُس کی وفاداری زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہوگی۔"

اس دور کے ترقی پسند ادیب، ادب کو دو سطحوں پر استعمال کر رہے تھے۔ ایک، اشتراکی نظام کی ترویج کے لیے اور دوسرے، پاکستانی معاشرے میں موجود مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کو فرسودہ اور عہدِ جاگیرداری کی یادگار قرار دیتے ہوئے اُن کی بیخ کنی کے لیے۔ شعر و ادب میں اگر حلقۂ اربابِ ذوق کے ادیبوں کا مرغوب موضوع اباحیت اور جنس پرستی تھا تو اشتراکی ادیبوں کا غالب رجحان مذہب دُشمنی، مسلم قومیت کی مخالفت، الحاد اور دہریت کی طرف تھا۔

یوں بظاہر ترقی پسند اور غیر ترقی پسند، دونوں قسم کے ادیب، ادبی مطلع پر چھائے رہے، لیکن بباطن وہ اپنے معاشرے کے تہذیبی اور ثقافتی دھارے سے کٹ گئے۔ برصغیر کے مسلمان بالعموم اور پاکستان کے مسلمان بالخصوص، مذہب کو جتنا عزیز جانتے ہیں اور عملاً چاہے وہ مذہبی تعلیمات سے کتنے ہی دُور ہوں لیکن نظریاتی اعتبار سے جس طرح وہ اس پر اپنی جان نچھاور کرنا بھی معمولی بات سمجھتے ہیں، اِس واضح معاشرتی حقیقت سے یہ ادیب بالکل بے خبر نکلے۔ انھوں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ مارکسیت کی اندھی تقلید میں مذہب پر براہِ راست حملہ کیا اور اُس سے وابستہ ہر تصوّر کو جہالت، رجعت پسندی، اوہام پرستی، کٹھ ملائیت اور جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ مفادات کا آلۂ کار بنا کر پیش کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عام لوگ اِن ادیبوں کی تحریریں پڑھتے تھے لیکن اُنھیں اپنے دِل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ نہیں پاتے تھے۔ محمد حسن عسکری نے اِس صورتِ حال کا جائزہ لیتے

CamScanner

ہوئے اپنے مضمون ''مسلمان اور ترقی پسندی'' میں بالکل ٹھیک کہا کہ:

''پاکستان کا قیام ترقی پسندوں کو کسی بدنیتی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنے نظریوں کے مجروح ہونے کی وجہ سے ناگوار گزرا اور آج صورتِ حال یہ ہے کہ جو تحریک عوام کی نمائندگی کے لیے اُٹھی تھی، پاکستان میں عوام کو اپنا مخالف نہیں، تو بیگانہ ضرور پاتی ہے۔ مسلمان قوم اور مسلمان ترقی پسندوں میں اِس سے زیادہ خلیج اور کہاں ہوگی، جو آج نظر آتی ہے۔''

اپنے ایک اور مضمون ''ہمارا ادبی شعور اور مسلمان'' میں انھوں نے اُس دور کے اُن ادیبوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو بین بین چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بقول محمد حسن عسکری:

''اُس دور میں ادیبوں نے اپنی حالت بھی عجیب معمے کی سی بنا لی تھی۔ نہ تو وہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے بالکل ہی الگ کر سکتے تھے اور نہ اُن میں شامل ہی ہوتے تھے۔ چنانچہ اس اندرونی تضاد کی وجہ سے بعض مسلمان ادیب بڑی مضحکہ خیز قسم کی ذہنی اُلجھنوں میں پڑ گئے۔ کبھی کہا۔۔۔ مسلم کلچر ہوتا ہے، کبھی کہا۔۔۔ نہیں ہوتا۔ کبھی سوچا کہ اُردو، عوام کی زبان ہے، کبھی خیال آیا کہ نہیں، محض ایک طبقے کی زبان ہے پھر اُوپر سے یہ فکر دامن گیر رہنے لگی کہ ہمارے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے، جس سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہو۔ آزاد خیالی کی ایسی دُھن سمائی کہ اپنے آپ کو کسی چیز سے لگاؤ ہی نہ رکھا۔ نہ کھل کے محبت کی، نہ نفرت۔ مختلف مسائل کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کرنے کے ڈر سے اُن پر بحث تک نہ کی۔ قوم کے اہم سے اہم مسائل کے متعلق یہی رویہ رہا کہ جیسے چلتا ہے، چلنے دو۔ اِن معاملات میں ہمارے ادیبوں نے کبھی اپنی ذمہ داری محسوس نہ کی۔''

اس کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان میں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ یقیناً اُس دور میں کئی ادیب ایسے بھی تھے، جو حب الوطنی کو جزوِ ایمان سمجھتے تھے۔ اُن میں احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، سیف الدین سیف، میرزا ادیب، خاطر غزنوی اور ہاجرہ مسرور وغیرہ ترقی پسندوں میں سے اور سعادت حسن منٹو، قدرت اللہ شہاب، احسان دانش، نعیم صدیقی، شورش کاشمیری، انجم رومانی اور اشفاق احمد وغیرہ غیر ترقی پسندوں میں سے، اس نقطۂ نظر کے حامی تھے کہ حکمرانوں سے اختلاف اپنی جگہ، لیکن ادیب کو اپنے ملک کے ساتھ ضرور وفادار رہنا چاہیے۔ یہ ادباء دیگر اشتراکی کوچہ گردوں کی طرح اپنی تہذیب، ثقافت، تاریخ اور ملی تشخص سے بیزار نہیں تھے، بلکہ اس پر فخر کرتے تھے۔ چنانچہ ہاجرہ مسرور نے ''ادبِ لطیف'' میں اپنے ایک مضمون میں کھل کر لکھا کہ:

''میرا ماضی، میرے طبقے کے لاکھوں، کروڑوں مسلمانوں کا ماضی ہے۔ وہ ماضی، وہ کلچر، زندہ تھا یا گلا سڑا، یا جو کچھ بھی تھا، مَیں اُسے اپنی زندگی سے کاٹ کر نہیں پھینک سکتی۔''

احمد ندیم قاسمی اگرچہ ترقی پسندوں کی دوسری کھیپ کے قافلہ سالار تھے اور اُن کا فکری جھکاؤ واضح طور پر بائیں بازو کے نظریات کی طرف تھا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے تحریکِ پاکستان میں ایک رضا کار کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ اِسی لیے وہ دوسرے کروڑوں مسلمانوں کی طرح پاکستان کو اپنی آرزوؤں کی آماج گاہ تصور کرتے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکرٹری جنرل ہونے کے باوجود وہ انتہا پسند اشتراکی ادیبوں کے کبھی مکمل طور پر ہم نوا نہ بن سکے۔ چنانچہ عارف عبدالمتین نے اپنے مضمون ''پاکستان کے شعری رجحانات'' میں اُنھی کے حوالے سے کہا کہ:

''اس میں شک نہیں کہ ہمارے بعض ساتھیوں نے حکمران طبقے کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر شروع شروع میں اِس ''آزادی'' کا سواگت کیا اور ہولناک ترین قتل و غارت کے بڑے خوبصورت شاعرانہ جواز بھی پیش کیے، مگر آخر کار اُن کے شعور نے اُنھیں جلد ہی اپنے دوسرے رفیقوں کا ہم نوا بنا دیا۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی نے ''طلوع'' میں تحریر کیا:

کلی چٹک بھی چکی، پھول رنگ لا بھی چکا
وہ رنگ جس کو جہاں نے لہو کا نام دیا
مہیب رات شفق میں نہا کے آئی ہے
مہیب رات کا آغاز تھا اگر غازہ
مہیب رات کا انجام بھی حنائی ہے
بجھا بجھا سا نہ دیکھو شہاب پاروں کو
یہ اِک عجیب سا احسانِ کبریائی ہے
جو آفتاب دیا ہم کو لالہ فام دیا!

مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انھوں نے ''آزادی کے بعد'' میں بڑے دردناک طریقہ پر اپنے گزشتہ تجزیہ کی مکمل نفی کرتے ہوئے لکھا:

کونپلوں سے اُگے ہیں انگارے
جن کی حدّت سے تپ رہا ہے بدن
بن رہے ہیں گلے سڑے پتے
کتنی جامد حقیقتوں کا کفن
روٹیاں، بوٹیوں میں تلتی ہیں
عصمتوں کی سجی دکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے
خون کا ذائقہ زبانوں پر
ایک آفاق گیر سناٹا
زندگی، زندگی، پکارتا ہے
سٹپٹاتا ہے، اپنے ہونٹوں سے
خون کی پپڑیاں اُتارتا ہے

عارف عبدالمتین کی یہ رائے ندیم کے بارے میں جزوی صداقت کی حامل ہے۔ یہ درست ہے کہ

انجمن کی سیکرٹری شپ کے زمانے میں وہ بھی اُسی انتہاپسندی کی لپیٹ میں آئے، جو اُن کے دوسرے ادبی رُفقا کو اپنی رَو میں بہائے لیے جا رہی تھی، لیکن احمد ندیم قاسمی بہت جلد اِس گھن سے نکل آئے۔ اُن کے مزاج میں جو اعتدال پسندی، سرشت میں جو وضع داری اور کردار میں جو شرافت موجود ہے، اُس کے ہوتے ہوئے وہ کبھی اپنے دیگر ترقی پسند ساتھیوں کی عکسی نقل بننے پر آمادہ نہ ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندوں میں احمد ندیم قاسمی وہ واحد ادیب اور شاعر ہیں، جنھوں نے پاکستان پر نازل ہونے والی ہر مصیبت کے موقع پر اپنا مثبت ردِّ عمل ظاہر کیا۔ ''کشمیر''، ''چھ ستمبر'' اور ''میں روتا ہوں'' جیسی نظمیں اُن کی حب الوطنی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

تاہم عام ترقی پسندوں کا رویہ وہی تھا، جس کی جھلکیاں آپ پچھلی سطور میں دیکھ چکے ہیں۔ اُن کے ادبی حریفوں۔۔۔ حلقۂ اربابِ ذوق والوں۔۔۔ کی حیثیت بھی وطن دوستی کے حوالے سے اُن سے چنداں مختلف نہ تھی۔ البتہ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اِن دونوں بڑے ادبی گروہوں سے ہٹ کر ادیبوں کا ایک اور گروہ بھی موجود تھا، جس کی رسائی ادبی رسائل اور ادبی مجالس تک تو نہیں تھی، لیکن عوام کے دِلوں تک ضرور تھی۔ اِن ادیبوں کو ہمارے پیشہ ور نقادوں نے کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا، لیکن وہ عوام کی نبضیں پہچانتے تھے، اُن کی اُمنگوں اور ولولوں کے رمز شناس تھے، اور اُن کی ادبی، جذباتی اور فکری ضروریات سے آشنا تھے۔ یہ وہ تاریخی اور معاشرتی ناول نگار تھے، جنھوں نے اُس فکری خلا کو پُر کیا، جو ترقی پسندوں کی دانستہ اور غیر ترقی پسندوں کی نادانستہ کوششوں نے پیدا کر رکھا تھا۔ نسیم حجازی، رئیس احمد جعفری، رشید اختر ندوی اور ایم اسلم کے نام سنتے ہی ہمارے سکہ بند نقادوں کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں، لیکن پاکستان کی تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب بقول وقار عظیم ''اِن کے تاریخی ناولوں کا مطالعہ، وقت کا سب سے محبوب مشغلہ بن گیا اور نسیم حجازی اور رئیس احمد جعفری کے ضخیم ناولوں کو صحیفوں کا رُتبہ ملنے لگا۔'' (تقسیم کے بعد ناول)

عوام کی اِس قلبِ ماہیت کے اسباب کیا تھے؟ وہی ترقی پسند ادیب، جو تقسیمِ ہند سے قبل برصغیر کے ادبی اُفق پر چھائے ہوئے تھے، قیامِ پاکستان کے بعد بتدریج لوگوں کی نظروں سے کیوں گرتے چلے گئے؟ اور اُن کے مقابلے میں ایسے ادیب، جنھیں وہ دوسرا کیا، تیسرا درجہ دینے پر بھی تیار نہ تھے، عوام کی آنکھ کا تارہ کیوں بنتے چلے گئے؟۔۔۔ اِس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مذکورہ بالا ادیبوں نے معاشرتی اور تاریخی ناول لکھنے کی ابتدا ایک واضح ملّی نصب العین کے ماتحت کی تھی۔ انھوں نے، بقول وقار عظیم ''زندگی کے انتشار و اضطراب کو دُور کرنے اور جماعتی زندگی کو سکون و مسرت کا کوئی راستہ دکھانے کی کوشش میں، اور اِس سے بھی زیادہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو فنا ہونے سے محفوظ رکھنے کے خیال سے اُن کے (عوام کے) ذہنوں کو ایسے ماضی کی طرف منتقل کیا تھا، جس میں انسانی عمل، نیکی کی راہوں پر گامزن اور انسانیت کی اقدار کا حامی و مددگار تھا۔۔۔ اسلامی زندگی کے ماضی میں فرد اور جماعت، دونوں کی زندگی، عملِ نیک کی مشعل سے روشن اور کامرانیوں کے نور سے فروزاں تھی، اور اسی لیے اس ماضی کے افسانے، فرد اور جماعت دونوں کے لیے، مستقبل کی درخشاں زندگی کا پیام بن سکتے تھے۔۔۔ اِن تاریخی ناولوں میں کہیں کہیں اسلامی تعلیم کے بنیادی تصوّرات کو پیشِ نظر رکھ کر ایک ایسے معاشرے کا تصوّر پیش کیا گیا ہے، جس میں خیر کی حکمرانی اور انسانی اقدار کی فراوانی ہے، اور خیر کے اِس معاشرے میں زندگی کے موجودہ تقاضوں کو پورا کرنے کے اِمکانات نظر آتے ہیں۔'' (تقسیم کے بعد ناول)

اِس کا مطلب یہ ہوا کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد پاکستانی ادیب ہونے کے ناتے جہاں بیشتر معروف ادیبوں نے اپنے قومی فرائض سے پہلو تہی اختیار کی، وہاں ادبی حلقوں میں نسبتاً کم معروف لیکن عوام میں مقبول ادیبوں نے ملّی اَنا اور قومی احساس کی مشعل کو نہ صرف تھاما، بلکہ وہ اسے لے کر بڑی جرأت مندی کے ساتھ آگے بڑھے۔ یہ مسلمان ادیب اِس اَمر سے واقف تھے کہ اپنی قومی ریاست کی تشکیلِ جدید میں بحیثیتِ ادیب اُن کی ذمے داریاں کیا ہیں؟ اور وہ اُن سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ گو وقار عظیم کے نزدیک اِن ناول نگاروں کی فکری کاوشوں کا حاصل ضرب، محض وعظ و نصیحت ہے اور وہ اسے ان ادیبوں کے ہنگامی احساس کا نتیجہ اور وقتی ضروریات کی بجا آوری کا ایک ذریعہ تصوّر کرتے ہیں، تاہم اگر خالصتاً ملّی شعور کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، تو اُن کی ادبی خدمات کی قدر و قیمت بدر جہا بڑھ جاتی ہے، کیونکہ انھیں کی کوششوں سے اُس مجرمانہ سکوت کا پردہ چاک ہوا، جسے ہمارے نام نہاد معروف ادیبوں نے دانستہ یا نادانستہ پاکستان کی ادبی فضا پر تان رکھا تھا۔

پھر وہ وقت آیا جب کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنّفین پر اُن کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے پابندی لگا دی گئی اور بعض ترقی پسند رسائل کچھ عرصہ کے لیے بند کر دیے گئے۔ جب اِن رسائل پر سے پابندی ہٹی تو انھوں نے ''ترقی پسند تحریک کا ترجمان'' جیسے سائن بورڈ اُتارے اور ''ادب اور آرٹ'' کے طغرے اپنی پیشانیوں پر سجا لیے۔

ترقی پسند تحریک کے دم توڑتے ہی بعض نئے ادبی رجحانات نے سر اُٹھایا۔ نئی شاعری کا غلغلہ بلند ہوا۔ آزاد نظم کو پہلے سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

بے معنویت اور مہملیت کے منفی رویوں نے نئے ادیبوں اور شاعروں کے ہاں راہ پائی۔ پرانے نظریات اور پرانی ادبی اقدار کو رد کرنے کا نعرہ بلند ہوا۔ افتخار جالب گروپ کے شعرا نے ترقی پسند تحریک کے ملبے پر اپنی ابہام پسندی اور لسانی تشکیلات کی نیو اُٹھائی۔ ملک میں جمہوری اقدار نے دم توڑا اور فوجی آمریت نے پاؤں پھیلائے تو نہ قوم کے پاس کوئی نصب العین رہا اور نہ ادیبوں کے پاس۔ پورے ملک پر ایک خوفناک فکری سناٹا چھا گیا اور ملک ایک وسیع قبرستان میں تبدیل ہو گیا۔ جسٹس ایم آر کیانی اور حبیب جالب جیسے اِکا دُکا باضمیر افراد کی آوازیں گاہے گاہے سکوت کی دیوار میں دراڑیں ڈالتی رہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے لکھنے والوں نے تخلیقِ ادب کو خطرے کی گھنٹی سمجھا اور اِسے گھاٹے کا سودا سمجھ کر یا تو اس سے تائب ہو گئے یا پھر ایسی علامتی، تجریدی، آزاد تلازماتی، بےضرر چیزیں لکھنے لگے، جو خوردبین سے بھی دیکھی جائیں تو احتساب کی زد میں نہ آ سکیں۔ ادیب کے اپنے ضمیر نے اُس کا محاسبہ کرنا چھوڑ دیا اور وہ خارج سے مسلط کی ہوئی دہشت کا شکار ہونے لگا۔ اُس نے اپنے اندر کی آواز پر کان دھرنے کی بجائے، باہر کے شور کو اہم سمجھا اور خود بھی اُسی لوٹ کھسوٹ میں شریک ہو گیا جس کے خلاف پہلے وہ صدائے احتجاج بلند کیا کرتا تھا۔ ادیب، اب تخلیقِ ادب کی کان نہیں، بلکہ جلبِ زر کی مشین بن گیا تھا۔

پھر ہماری تاریخ کا وہ بابِ منور کھلا، جس کے اندر جھانکنے سے اِس گم شدہ قوم کو اپنا سراغ ملا۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کا دِن، پاک سرزمین پر بھارتی یلغار کا پہلا دِن ہے اور یہی دن، پاکستانی قوم کے خوابِ غفلت سے جاگنے کا پہلا دِن بھی ہے۔ اُس روز ہمارے ادیبوں نے صحیح معنوں میں محسوس کیا کہ وہ کیا ہیں؟ اور اُن کی قومی اور ادبی ذمے داریاں کیا ہیں؟ جنگی ترانے، قومی گیت، نظمیں، غزلیں، افسانے، ڈرامے، تمثیلچے، فیچرز، اور نظریاتی مضامین وغیرہ اس نئی بیداری کی ظاہری صورت تھے، جب کہ بباطن، پوری قوم کے اندر ایک انقلاب برپا ہوا۔ اب جو ادب تخلیق ہوا، اُس میں جہاں ہمارے ادیبوں کا اخلاص شامل تھا، وہاں اُس میں پوری پاکستانی قوم کے دِل کی دھڑکنیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پاکستانی ادیبوں کو غالباً پہلی مرتبہ اجتماعی طور پر محسوس ہوا کہ وہ ایک الگ قوم کے افراد ہیں اور اُنھیں اپنے فن پاروں کو قومی وجود کی بقا کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اُن کے فن پارے ایسے مجلّا آئینے تھے، جن میں پوری قوم اپنی آرزوؤں کا عکس دیکھ رہی تھی۔

پاکستان کی تاریخ میں دوسرا بڑا سانحہ سقوطِ مشرقی پاکستان تھا، جس نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ قوم کا ہی نہیں، ہمارے ادیبوں کی حب الوطنی کا امتحان بھی تھا۔ مشرقی پاکستان کے الگ ہونے اور قائداعظم کے پاکستان کے دولخت ہونے کا دُکھ، اجتماعی دُکھ تھا اور اس نے بھی ہمارے ادبی شعور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اِس المیے کی تصویریں افسانہ نگاری، شاعری اور رپورتاژ میں خاص طور پر اُبھریں اور اس نے کہیں کہیں دیگر اصنافِ ادب میں بھی اپنی جھلکیاں دِکھائیں۔ مثال کے طور پر مسعود مفتی کی ''چہرے''، ''ریزے''، ''لمحے''، ''ہم نفس'' اور ''چہرے اور مُہرے'' اور صدیق سالک کی ''ہمہ یاراں دوزخ'' وغیرہ کا پس منظر، سانحہ ڈھاکہ ہے، تاہم خوش آئند بات یہ ہے کہ ہمارے ان ادیبوں کی وطن دوستی، ان تصانیف میں غم کی تاریکیوں میں کہیں مدھم نہیں ہوئی۔ رہے شاعر، تو کیا نئے اور کیا پرانے، سبھی نے اس المیے کو شدت سے محسوس کیا۔ آپ اِس دور میں چھپنے والا کوئی شعری مجموعہ یا ادبی رسالہ اُٹھا کر دیکھ لیں، کوئی نہ کوئی نظم اور غزل کا کوئی نہ کوئی شعر اِس قومی سانحے پر ماتم کرتا دِکھائی دے گا۔ حتیٰ کہ بعض نئے شاعروں کی تو پوری پوری غزلیں، اِس سانحے کے غم میں سیاہ پوش نظر آتی ہیں۔

اپنے ملک کا نصف حصہ کٹ جانے کے المیے نے ہمارے ادیبوں کو ایک بار پھر قوم، ملک، تہذیب، ثقافت، زبان اور فن کے حوالے سے پاکستانی ادب کے مسئلے پر سنجیدگی سے سوچ بچار کی طرف مائل کیا۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''پاکستانی کلچر'' تو خیر پہلے کی چیز ہے (اور خاصے کی چیز ہے)۔۔۔ البتہ حالیہ برسوں میں فتح محمد ملک کی ''تعصبات''، احمد ندیم قاسمی کی ''تہذیب وفن (جلد اوّل۔)'' اور مختار مسعود کی ''آوازِ دوست'' پاکستانی ادب اور پاکستانی ثقافت کے خدوخال واضح کرنے میں خاصی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے ''اُردو ادب میں پاکستانیت کا مسئلہ'' ڈاکٹر وزیر آغا نے ''کلچر اور پاکستانی کلچر'' اور ڈاکٹر انور سدید نے ''پاکستانی ادب کا مسئلہ'' میں بھی پاکستانیت کے حوالے سے کئی فکر انگیز سوالات اُٹھائے ہیں۔ اسی روشنی میں کچھ عرصہ پہلے کے لکھے ہوئے سجاد باقر رضوی کے مضمون: ''پاکستانی تہذیب کا مسئلہ'' (تہذیب وتخلیق) اور ڈاکٹر سلیم اختر کے مقالے ''پاکستانی کلچر کا مسئلہ'' (سیپ شمارہ نمبر ۲۵) کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ سب نقطۂ نظر کے اختلاف کے باوجود مسئلہ زیرِ بحث پر سنجیدگی سے غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں عطاالحق قاسمی اور مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامون، سلیم احمد، شمیم احمد، سراج منیر، ہارون الرشید، فروغ احمد، امجد اسلام امجد اور توصیف افضل کے تنقیدی مضمونوں، خدیجہ مستور اور فضل احمد کریم فضلی کے ناولوں میرزا ادیب کے ڈراموں اور انتظار حسین، اشفاق احمد، الطاف فاطمہ، آثم میرزا، محمد منشایاد، بشریٰ رحمٰن، سیّد قاسم محمود اور غلام الثقلین نقوی کے تازہ افسانوں میں بھی پاکستانی ادب کے خدوخال تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

CamScanner

پاکستانی غزل اکیسویں صدی میں (روایتی موضوعات)

لبنیٰ صفدر/ لاہور

کائنات

قدرت کے رازوں میں ایک سربستہ راز کائنات ہے۔ یہ کائنات انسان کے لیے ہمیشہ حیرت کا مرکز و محور رہی ہے۔ تجسس کا سرچشمہ رہی ہے۔ انسان کے خیالات اور جذبات واحساس کے اظہار کی چونکہ قدیم ترین زبان شاعری ہے اس لیے کائنات سے متعلق مضامین کالدیا، بابل، ایران، اشوریہ، چین، ہندوستان، مصر، فلسطین، یونان، روما اور ہندوستان کی تہذیبوں، تمام مذہبی کتابوں اور دانش اور حکمت کے حوالوں میں ملتے ہیں۔ کائنات روایتی اُردو غزل کا بھی سب سے بڑا موضوع ہے اور جدید غزل کا بھی۔ انگریزی کے ایک شاعر کا قول کائنات سے متعلق کچھ یوں ہے:

ایک آہنگ سے، ایک فردوسی آہنگ سے اس کائنات کے ڈھانچہ کی ابتدا ہوئی۔ اسی آہنگ کو صوفی نے حسن ازل کہا اور شاعر نے محض حسن۔

کائنات سے متعلق روایتی مضمون کو اقبال نے بالکل منفرد اور نئے انداز میں بیان کیا ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون
(اقبالؔ)

انسان اشرف المخلوقات ہے اور اسے پہلے دن سے اس بات کا احساس ہے کہ یہ کائنات اس کے لیے بنائی گئی ہے۔ روایت کی طرح جدید غزل گو شعراء نے بھی اس موضوع کو کئی رنگ میں باندھا ہے۔

یہ کائنات بنائی گئی ہے میرے لیے
کوئی بھی چیز یہاں مجھ سے قیمتی نہ سمجھ
(احمد سبحانی آکاش)

چھلک اُٹھا ہوں اگر ساری کائنات سے میں
تو کیا یہ خاک ترے چاک سے زیادہ ہے
(عظیم حیدر سیّد)

کائنات اور نظام کائنات سے متعلق انسان کا تجسس جدید دور میں اور بھی فزوں دکھائی دیتا ہے اور یہ خواہش جدید شعراء کے دل میں مسلسل پنپتی رہتی ہے۔

اور اب تو خواہش نظارہ یہ بھی چاہتی ہے
یہ کائنات مرے سامنے دوبارہ بنے
(سعود عثمانی)

میں کہاں ہوں مجھے پتہ تو چلے
میری آنکھوں سے کائنات گزار
(منیر سیفی)

یہ کائنات جو حسن و جاذبیت کا نگار خانہ ہے رنگ تخالف سے مزین نظر آتی ہے۔ کائنات کے حسن و دلکشی کی وجہ حقیقی یہ ہے کہ اس کے عناصر ترکیبی میں مناسب و ہم آہنگ پائی جاتی ہے۔ روایتی غزل میں میرؔ کا یہ احساس کہ

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا
(میرؔ)

اور یہی احساس آج کے جدید غزل گو شعرا کے ہاں کچھ یوں آیا ہے:

اتنا شفاف ہے یہ آئنہ کون و مکاں
سانس لیتا ہوں تو دھندلا نظر آتا ہے مجھے
(احمد نوید)

گوپی چند نارنگ کے بقول:

”ذات اور کائنات میں اور ذات اور کائنات سے باہر بھی فن کا سفر موجود سے لاموجود اور لاموجود سے موجود کا سفر ہے۔“(۶)

ذات سے کائنات تک انسان کی سوچ کے کئی پہلو کئی زاویے ہیں۔ کبھی تو اُسے مکمل کائنات بے مقصد اور بے مایہ نظر آتی ہے اور کبھی کبھی ایک شخص مکمل کائنات کے روپ میں ڈھل جاتا ہے۔

پہلے اک شخص میری ذات بنا
اور پھر پوری کائنات بنا
(محبوب خزاں)

گر تم مری شریکِ سفر ہو تو ساتھ دو
آؤ گلے لگائیں غمِ کائنات کو
(سبط صبا علی)

یہ کائنات کیا ہے؟ یہ سوال ہر انسان اور خاص کر شاعر کے ہاں ذہن میں روزِ ازل سے موجود ہے اور اُس وقت تک رہے گا جب تک انسان اس کا جواب مکمل طور پر حاصل نہیں کر لیتا۔ بقول ڈاکٹر افتخار بخاری:

”یہ تمام تر کائنات ایک پہیلی ہے جسے بوجھنے میں انسان کروڑوں سالوں سے مگن ہے۔“(۷)

حسن و عشق

جدید اُردو غزل میں بھی روایت کی طرح بہ اعتبارِ مضامین و موضوعات، وسعت اور ہمہ گیری، تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ روایت کے اور موضوعات کی طرح حسن و عشق کی مکمل ترجمانی ہے۔ اردو غزل نے حُسن و عشق سے متعلق معاملات کا بھرپور احاطہ کیا ہے۔ روایت میں عزیز لکھنوی کا یہ شعر حُسن کی نئے انداز میں ترجمانی کرتا ہے۔

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حُسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
(عزیز لکھنوی)

روایتی غزل اور جدید غزل دونوں میں محبت اور عشق کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھا گیا ہے۔

CamScanner

درحقیقت یہ دونوں لفظ اپنے اندر معنوی اعتبار سے کچھ مطابقت بھی رکھتے ہیں اور گہری خلیج بھی۔ مگر شعرا کی کثیر تعداد نے انہیں ہم معنی سمجھ کر استعمال کیا ہے۔

اک لفظِ محبت کا اتنا سا فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے
(جگر مرادآبادی)

نشۂ عشق میں ہر چیز اُڑی جاتی ہے
کون ذرّہ ہے کہ سرشارِ محبت میں نہیں
(اصغر گونڈوی)

مختلف ادوار میں وقت کے ساتھ ساتھ حُسن وعشق کے نئے نئے مضامین غزل میں جگہ پاتے گئے۔ جدید غزل گو شعرا نے اس روایتی مضمون کو بڑے ڈھنگ، سلیقے اور نئے نئے انداز سے بیان کیا ہے۔

حُسن نے خود کہا مصورؔ سے
پاؤں پہ میرے کوئی ہاتھ بنا
(غلام محمد قاصر)

سقراط جو یونان کا سب سے پہلا فلسفی تعلیم کیا جاتا ہے وہ حُسن کو ذاتِ خداوندی کا مظہر سمجھتا ہے۔ بقول نصیر احمد ناصر:

"وہ اپنے متقدمین کی طرح تناسب و ہم آہنگی کو حسن کے ناگزیر اجزائے ترکیبی سمجھتا ہے۔"(۸)

حسن کو ماضی میں پھول اور چاند سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے۔ جدید شعراء کے ہاں انداز دیکھئے کہ ان مضامین کو کیسے وسعت بخشی ہے۔

اُسے تشبیہ کا دوں آسرا کیا
وہ خود اک چاند ہے تو چاند سا کیا
(عدیم ہاشمی)

ہم کو ہر چیز میسر تھی بجز پھولوں کے
تم اگر پھول نہ ہوتے تو ہمارے ہوتے
(اشفاق ناصر)

حسن ایک ایسی مجرد حقیقت ہے جو اپنے مظہر کی استعداد کے مطابق صورت پذیر ہوتی ہے۔ جدید غزل میں اس کا رنگ دیکھئے:

میں تجھ کو دیکھ کے خود کو حسین کرتا ہوں
ترے جمال سے مجھ پر جمال آتا ہے
(کنور امتیاز احمد)

حسنِ مطلق نے اپنے آپ کو آشکار کرنا چاہا تو مظاہرِ حیات کو وجود بخشا۔

عشق اور محبت ایک لازوال اور لامحدود موضوع ہے۔ عشق کی لو ہمیشہ حسن سے اونچی رہی ہے۔ میر کے ہاں عشق خدا ہو گیا ہے اور غالب کے ہاں دماغ کا خلل ٹھہرا ہے۔ بقول ڈاکٹر سعد اللہ کلیم:

"اُردو غزل میں جہاں حسن اپنی آخری لطیف ترین صورت میں اللہ تعالیٰ کی صفت ٹھہرتا ہے۔ وہاں عشق صفات بشریٰ کے دائرے میں آتا ہے۔"(۱۰)

جدید غزل گو شعراء اس روایتی مضمون کو نئے اسلوب کے پیکر میں کیا خوب ڈھالتے دکھائی دیتے ہیں:

جلا کے سب خس جاں راکھ دان چھوڑتا ہے
میاں یہ عشق ہے جان لے کے جان چھوڑتا ہے
(عباس تابش)

عشق وہ سمندر ہے جس میں ڈوبنے والے
ابر بن کے اُٹھتے ہیں لہر بن کے آتے ہیں
(حسن عباسی)

میں نے اور قیس نے قانون بنایا ہے کہ عشق
دوسری بار بھی ہوتا ہے نہیں بھی ہوتا
(افضل خاں)

وہ ایسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں باقی
محبت جیسے رستے میں پڑی ہے
(باقی احمد پوری)

اُردو غزل کی مجموعی روایت نے فنا کو عشق کا پہلا قدم قرار دیتے ہوئے بقا کو اس کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ عشق انسانی جذبات کا جوہر ہے جہاں انسان ہے وہاں عشق ہے۔

قبولِ عشق سے پہلے کہاں نکلتا تھا
جو رنگ اب ترے رُخسار سے نکلتا ہے
(اعجاز توکل)

ہم لوگ صرف عشق ہی کرتے ہیں، چھوڑ دیں؟
چھوڑا!! اور اب جو اتنی فراغت ہے، کیا کریں؟
(سیّد امتیاز احمد)

عشق اور عشق کے آداب کا کیا کرنا ہے
تو نہیں ہے تو کسی خواب کا کیا کرنا ہے
(قیوم طاہر)

دل پہ جذبوں کا راج ہے صاحب
عشق اپنا مزاج ہے صاحب
(لبنیٰ صفدر)

جب تک کائنات ہے زندگی ہے۔ حسن اور عشق کے معاملات چلتے رہیں گے۔ عشق، حسن اور محبت کو شاعری کے موضوعات میں ہمیشہ اولیت رہے گی۔ کیونکہ تفہیم خدا، تفہیم کائنات اور تفہیم ذات اس جذبے کے بغیر ممکن نہیں۔ جدید غزل گو شعراء کے ہاں اس کے مختلف احساس اور رنگ نظر آتے ہیں۔

حسن وہ خواب نہیں ہے جو مکمل ہو کبھی
عشق وہ کیف نہیں ہے کہ جو کامل ہو جائے
(روش صدیقی)

نہ ملا کر اُداس لوگوں سے
حسن تیرا بکھر نہ جائے کہیں
(ناصر کاظمی)

کچھ عشق تھا کچھ مجبوری تھی سو میں نے جیون وار دیا
میں کیسا زندہ آدمی تھا، اک شخص نے مجھ کو مار دیا
(عبیداللہ علیم)

چاہت میں کیا دنیا داری عشق میں کیسی مجبوری
لوگوں کا کیا سمجھانے دو اُن کی اپنی مجبوری
(محسن بھوپالی)

CS CamScanner

وہ مرنے سے بہت ڈرنے لگا ہے
اُسے اتنی محبت دے رہا ہوں
(حسن عباسی)

عشق میں دوہری مشقت کی ہے
حالتِ ہجر میں ہجرت کی ہے
(شاہین عباس)

عشق اذیت ناک بھی ہے اور صبر طلب بھی
لیکن اس میں بندہ تازہ دم رہتا ہے
(ارشد شاہین)

مجھے یہ زعم کہ میں حسن کا مصور ہوں
انہیں یہ ناز کہ تصویر تو ہماری ہے
(شبنم رومانی)

خوشی اور غم

یہ کائنات متضاد اشیاء کا مجموعہ ہے اور اسی سے ہی اس کی خوب صورتی مکمل ہوتی ہے۔ دھوپ چھاؤں، صبح و شام، بہار و خزاں کی طرح انسان کی زندگی میں خوشی اور غم کی بھی بنیادی اہمیت ہے۔ خوشی کا احساس ہمیں اس لیے ہوتا ہے کہ غم ہے۔ انسان خوشی کا اظہار ہنس کر اور غم کا رو کے کرتا ہے یا اسے تجسیم کرنا ہو تو تصاویر یہ پینٹنگز، مجسمے بناتا یا شاعری میں اُس کا اظہار کرتا ہے۔ یہ روایتی موضوع اپنے اندر انسانی جذبوں کا بھرپور عکاس ہے۔

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا
(میر)

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت غم سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
(غالب)

جدید غزل گو شعرا کے ہاں خوشی اور غم کا اظہار منفرد بھی ہے اور اچھوتا بھی۔

غم کی دکان کھول کے بیٹھا ہوا تھا میں
آنسو نکل پڑے ہیں خریدار دیکھ کر
(محمد یامین ہاشمی)

ہر گھر میں اک ایسا کونا ہوتا ہے
جہاں کسی کو چھپ کر رونا ہوتا ہے
(انجم خیالی)

بقول گوپی چند نارنگ:

"دکھ درد اور غم کا رشتہ جبر سے ہے۔ جہاں جبر ہے کسی نہ کسی غم کا رشتہ ضرور ہوگا اور جہاں غم ہے وہاں کوئی نہ کوئی جبر ضرور ہوگا۔"

دُکھ اور طرح کے ہیں دعا اور طرح کی
اور دامنِ قاتل کی ہوا اور طرح کی
(افتخار عارف)

یہ روایتی موضوع جدید شعرا کے ہاں محبت میں گندھا ہوا اور بھی پر تاثیر ہو جاتا ہے۔

وہ اشک بن کے مری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے
(بسمل صابری)

وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے
رو پڑا وہ آپ مجھ کو حوصلہ دیتے ہوئے
(ریاض مجید)

روایتی اور جدید شاعری میں بھی خوشی کے اظہار سے زیادہ آنسوؤں کا ذکر ہے۔ سمندر کو بھی انسان کے اشکوں کی سوغات کہا جاتا ہے۔ جدید شعرا کے ہاں اشک عمر بھر کی کمائی ہے۔

آخر میں ہنس پڑوں گا کسی ایک بات پر
رونا تمام عمر کا بیکار جائے گا
(خورشید رضوی)

کہیں کہیں خوشی اور غم کا احساس بالکل نئے اور اچھوتے انداز میں ملتا ہے۔

بچوں نے بنا ڈالے ہیں کھلتے لب و رُخسار
آنکھیں اسی کاغذ پہ بنا دیں تو رُلا دیں
(حسنین سحر)

خوشی میں غم کا احساس انسان کے اندر کے خوف کی نشاندہی کرتا ہے۔

اچھی قسمت، اچھا موسم، اچھے لوگ
پھر بھی دل گھبرا جاتا ہے بعض اوقات
(منظر نقوی)

اب اُداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں
(شعیب بن عزیز)

مجھے اپنے ضبط پہ ناز تھا سرِ بزم رات یہ کیا ہوا
مری آنکھ کیسے چھلک گئی مجھے رنج ہے، یہ برا ہوا
(اقبال عظیم)

بقول ڈاکٹر افتخار بخاری:

"یہ متحارب اور مخالف عوامل آخر کیا ہیں؟ یہ خوشی اور غمی ہے۔ یہی زندگی کا پورا پن ہے۔ ورنہ انسان اگر ہمیشہ خوش رہتا تو خوشی اور سکون کا احساس ہی کھو دیتا۔"

ہر وقت کا ہنسنا تجھے برباد نہ کر دے
تنہائی کے لمحوں میں کبھی رو بھی لیا کر
(محسن نقوی)

غزل کے شعرا نے اجتماعی غم کو اپنی ذات کا غم بنایا ہے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
(امیر مینائی)

بقول احسان قادر:

"بڑا شاعر اپنے ذاتی غم کو اجتماعی غم اور پورے عہد کے غم اور دکھ کو اپنے دکھ میں شامل کر لیتا ہے۔"(۱۲)

❀❀❀

روشنی کی جھلمل میں طنطناتی شاعری

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

کسی بھی کتاب یا فن پارے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اسکے منصہ شہود پر آنے کے بعد کون کونسے نئے علمی و فنی مباحث چھڑتے ہیں اور ان مباحث میں ایک عام قاری سے لیکر معاشرے کے کون کون سے سیگمنٹ حصہ لینے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ پھر یہ بھی خاص اور قابل ذکر بات جانی جاتی ہے کہ ان مباحث سے حاصل ہونے والے نتائج اور زیر بحث آنے والے نکات کی تشریح و توجیح معاشرے کی ادبی اور علمی ذخیرے میں کس حد تک اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

اور الحمدللہ، جناب واحد سراج صاحب کے پہلے شعری مجموعے نے سامنے آتے ہی ان کے کلامِ متصف سے زیادہ اپنے عنوان کے حوالے سے مختلف علمی و ادبی مباحث چھیڑ کر اپنی اہمیت کا عمدہ اعلان کر دکھایا۔ بہت سے عالم و فاضل شعرا، ان گنت صاحبانِ فہم و ادراک ادبا اور متعدد اہلِ فراست دانشوران اس عنوان کے سحر میں یوں مسحور ہوئے کہ ہر ایک نے اپنے تئیں اس پر اظہارِ خیال کیا اور خوب کیا۔ عنوان کیا ہے۔ ایک علمی امتحان ہے۔ ''روشنی ایک حادثہ ہے'' ۔ جی ہاں امتحان ہے یہ سائنسی علوم کے متوالوں کا۔ امتحان ہے یہ دینی اور الہامی علوم کے جاننے والوں کا۔ امتحان ہے یہ عمومی علوم کے دلدادگان کا۔ اور پھر امتحان ہے یہ ادبی دنیا کے ناقدین اور مبصرین کا۔ کہ روشنی ایک حادثہ ہے۔ صرف اس بیان کی تائید، تشریح یا ممکنات کے شواہد اور حوالے پیش کر کے اپنا فرض ادا کیا جائے یا اس عنوان کے تحت سامنے آنے والی کتاب کی تفہیم اور اس کے تخلیق کار کی لگ بھگ نصف صدی کی ریاضت، زندگی کے نشیب و فراز سے آگہی، رموزِ کائنات سے ملنے والے اشاروں کی تفہیم، کارہائے زمانہ پر آفاقی تناظر میں وجدانی رسائی، حادثات زمانہ سے سسکتی بلکتی انسانیت کی حالتِ زار پر اظہارِ افسوس، علوم صحیحہ سے روگردانی پر تاسف اور سب سے بڑھ کر روشنی کے الہامی اور آفاقی مطالب سے مکمل آشنائی کو زیر نظر رکھتے ہوئے ایک شاہکار شعری مجموعے کی اشاعت پر اس کی علمی، ادبی سماجی اور معاشرتی اہمیت کے حوالے سے کچھ کہا جائے۔

اس شاہکار شعری مجموعے پر بہت سی تقاریب اور ان میں ہونے والی گفتگو میں جو کچھ کہا اور سنا گیا اسمیں عنوان پر تو عالمانہ و فاضلانہ بات چیت بدرجہ اُتم کی گئی مگر اس شاہکار کتاب کے بہت سے قابل ذکر اور لائقِ داد و تحسین مشمولات عنوان کی چکا چوند میں اپنی چمک اور آب و تاب دکھانے میں کچھ پیچھے رہ گئے۔

اس میں شک نہیں کہ کتاب کا ٹائٹل ہے ہی اتنا بھرپور، وسیع الجہات، جاذب نظر و فکر اور وسیع المطالب کہ ایک تقریب کے تناظر میں کسی مبصر عالم کا ممکنہ وقتِ گفتگو اس مجموعہ کلام کے دیگر پہلوؤں پر کچھ کہنے لکھنے کا شاید ہی متحمل ہو پاتا ہو اور پھر ایک اور بات کہ مجموعی طور پر اس اہم شعری کاوش کا ایک بڑا حوالہ بھی عنوان کے گرد ہی گھومتا نظر آتا ہے۔ تاہم کتاب مذکورہ کا عمیق مطالعہ ہمیں اس کی ہمہ گیری اور متنوع موضوعات پر مصنف کے بلند و بالا علمی مقام، آفاقی مشاہدات، ذاتی تجربات، اور انسانی ہمدردی اور اصلاح احوال کے جذبے سے سرشار احساسات و جذباتِ حمیدہ سے کشیدہ شذرات، زباں و بیاں کی ارفعیت کے ساتھ اعلیٰ ذوقِ نظر سے چنیدہ الفاظ و تراکیب، کیف آفریں قافیہ و ردیف، اچھوتے مضامین، عمدہ تصورات، مستند تلمیحات، قلیل و طویل بحور کا استعمال، اردو اور ہندی کے حسین امتزاج سے نمو پانے والی دلکش شعری فضا کے حسین خدوخال اور اس سے بڑھ کر خیال کی پختگی اور الفاظ کے دروبست میں بلا کی شائستگی اس امر کی متقاضی ہے کہ عنوان کی درخشندگی سے قطع نظر بھی اس کتاب کو دیکھا جائے۔ جس میں جناب واحد سراج جیسی مایہ ناز علمی شخصیت کے گوہر ہائے نایاب کی شعری و ادبی تمکنت جلوہ نما ہے۔

جی ہاں۔ عنوان کہتا ہے روشنی ایک حادثہ ہے۔ اور جناب سراج اس بحث میں خود نہیں پڑتے بلکہ ایک انمول نظم کی صورت میں اس حوالے سے روشنی کے جملہ مطالب واضح کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں اور یہ بحث وہ ناقدین، مبصرین اور قارئین کے لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ روشنی ایک حادثہ ہے کہ نہیں، اگر یہ حادثہ ہے تو کیا یہ ایک خوشگوار حادثہ ہے، کیا روشنی حادثہ ہے یا واقعہ۔ روشنی پہلے ہے یا تاریکی۔ البتہ وہ خود بڑی عمدگی کے ساتھ صحاف ربانی کے حوالوں سے اندھیرے کو نور کا عدم گردانتے ہیں اور تیرگی کو نور کے تار کی گرہ سے منسوب کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بتلاتے ہیں کہ جونہی یہ گرہ کھلی تو فقط نور کا ہی سلسلہ رہے گا۔

سبھی صحیفوں میں
نور
مذکور تھا
تبھی تو ہمیں یقیں تھا
اندھیرا خود کچھ بھی نہیں
فقط نور کا عدم ہے
یہ تیرگی صرف نور کے تار کی گرہ ہے
گرہ کھلی تو

فقط نور کا سلسلہ رہے گا
زمین پر نور کی اگر سلطنت بنی تو
ڈگر ڈگر خیریت رہے گی
نگر نگر عافیت رہے گی------

یہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ جناب سراج حق اور انصاف کو روشنی سے تعبیر کرتے ہیں اور نظم کے اگلے حصے میں جن مظالم، جبر، استبداد اور نا انصافی کا ذکر ہے اسے تیرگی ہی کہا جا سکتا ہے۔ پھر اس نظم میں اس بات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ تیرگی ایک کائنات ہے یعنی ظلم اور نا انصافی دیو ہیکل ہے اور غالب ہے جبکہ روشنی یعنی انصاف اور حق و سچ اس کے مقابلے میں بہت قلیل الجثہ ہے۔ بالکل سادہ الفاظ میں یوں ہوا کہ روشنی اور تیرگی حق اور باطل کے استعارے ہیں۔ اور جنابِ واحد سراج نے ان استعاروں کو اپنے پورے کلام کا مرکزی نقطہ نظر بنا رکھا ہے، جبھی تو انکی غزلیات، قطعات، اور دیگر نظمیہ شاعری میں جا بجا ان استعاروں کا عمدہ، پُر اثر اور معنی خیز استعمال موجود ہے۔ ایک غزل کا شعر دیکھئیے:

اب اُس کا فیصلہ تسلیم ہوگا
لگے گی جو کچہری روشنی میں

اس حوالے سے ہٹ کر دینی و اسلامی علوم سے رغبت کی بات کریں تو مصنف کی علمی رسائی اور ذوقِ مطالعہ کی پختگی خود بولتی نظر آتی ہے۔ کتاب کی ابتدا میں حمد شریف ہے جس کے چھے اشعار میں سے پانچ میں حمدِ باری تعالیٰ کے لئے مستند اور ایمان افروز تلمیحات کا استعمال کیا گیا ہے۔ پھر فرمانِ خداوندی ہے۔ (کل من علیھا فان و یبقا وجہُ ربک ذوالجلال والاکرام)۔ اور اس آیت مقدسہ کی روشنی میں جناب واحد [illegible] کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

[illegible] ہو یا ہو فنا کچھ نہیں ہے رہنے کا
بجز خدا، بخدا، کچھ نہیں ہے رہنے کا

اسی طرح ایک اور قرآنی آیت (الیوم نختم علیٰ افواھھم وتکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم بما کانو یکسبون)۔ کے مفہوم سے ماخوذ خیال کو یوں شعری قالب میں ڈھالتے ہیں:

دینے کو ہے گواہیاں اب یہ گواہِ معتبر
دیکھیں! مرا وجود ہی میرے خلاف ہو گیا

جنابِ سراج محض ایک عمدہ شاعر اور بڑے ادیب ہی نہیں وہ ایک مایہ ناز ماہر تعلیم اور قابل تحسین معلم بھی ہیں۔ ان کا مقام جس بات کا متقاضی ہے وہ اسے بھی خوب جانتے ہیں اور اس سے عہدہ برا ہونے کا اہتمام بھی بڑی نفاست کے ساتھ کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ خود بھی وقت کا ایک ثانیہ تک رائیگاں نہیں جانے دیتے اور اپنے ہم نفسوں سے بھی یہی امید رکھتے ہیں۔ مگر جس وقت انکی نظر معاشرے کی اجتماعی بے حسی اور خوابیدگی پر پڑتی ہے تو ان کی نوکِ قلم سے ان کے جذبات کی یوں ترجمانی ہوتی ہے:

راستے بجھتے چلے جاتے ہیں راہرو کے لیے
سونے والوں کو بہت سونے دیا جاتا ہے

وہ ایک طرف تو خفتگاں وقت کو دستک دیتے ہیں تو دوسری جانب دنیا کو دارالاسباب کے طور پر بھی جانتے ہیں اور اس کی دارالامکانات کی تعریف سے بھی واقف ہیں۔ میری اور ان کی رفاقت کوئی دو دہائیوں پر محیط ہے اور اس دوران متعدد مقامات پر میرا ذاتی مشاہدہ رہا ہے کہ انھیں مستحکم شواہد اور مضبوط دلائل بھی کسی کے منفی رویے اور منفی سوچ سے نا امیدی کی عین ممکنہ فضا تک لے جانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے، بلکہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے کوئی ایک ایسا مثبت پہلو نکال لیتے ہیں کہ دوسرے کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اسی حوالے سے ان کے کلام میں بھی یہ خوبی نمایاں ہے۔
شعر دیکھیے:

یقیں میں ہیں جو پیوند بے یقینی کے
تو خواہشوں میں بھی اک رنگ احتمال کا ہے
سیاہ رات میں رستہ دکھا گئی تھیں مجھے
جلا کے مشعلِ امید، مہرباں آنکھیں

اس کے ساتھ ہی ان کی نظر فلسفہ حیات کی دبیز تہوں میں پوشیدہ اسرار و رموز پر بھی رہتی ہے اور ان کی واقفیت سے ایک ایسی فضا قائم ہوتی ہے جس میں تسلی اور تشفی کا عنصر نمایاں ہے۔ ذرا آگے چلیں تو یہی فضا نفسِ مطمئنہ کی صورت نمایاں ہوتی ہے اور وہ کہہ اُٹھتے ہیں:

کیا برائی ہے جو میں کامل نہیں
اَکملیت، زیست کا حاصل نہیں

....

وہ حفاظت سے مجھ کو رکھتا ہے
اپنی مرضی سے مارنے کے لئے

....

میں نے لوگوں پہ وار دی ساری
زندگی تھی ہی وارنے کے لئے

اور یہی نفس مطمئنہ جب اپنے ارد گرد موجود قرابت داروں کے روّیوں پر نظر دوڑاتا ہے اور قدم قدم پر رشتوں کی نا قدری اور معمولی لغزشوں اور چپقلشوں پر بھی قطع تعلق کے مناظر دیکھتا ہے تو چیخ اُٹھتا ہے:

ذرا سی بات پر رشتوں کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں
پھر اس کے بعد یوں ہوتا ہے، گھر تقسیم ہوتے ہیں

....

تیرے لبوں کے تصدق پہ میں نثار مگر
سنا رہی ہیں کوئی اور داستاں، آنکھیں

زیرِ نظر کتاب کی ورق گردانی ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کی صاحب کتاب کسی پیر مردِ جہاندیدہ کی طرح اپنے چہار سو رونما ہونے والے ماضی و حال کے احوال

سے بھی واقف ہیں اور ان احوال کی جزیات کا ادراک بھی رکھتے ہے۔ شکاگو کے مزدوروں کی جد جہد کی پاداش میں نہ جانے کتنوں کو موت کی آغوش میں جانا پڑا تھا اور پھر مغرب کی جادوگری اور فسوں کاری پر نظر ڈالئے۔ پہلے ان کو نیست و نابود کر ڈالا اور پھر ان کی یاد میں دنیا بھر کے محنت کشوں پر احسان جتاتے ہوئے بین الاقوامی یوم مزدور کا ڈھونگ رچا کر اپنے کرتوتوں کی پردہ پوشی کا سامان مہیا کر دیا۔ مگر جنابِ واحد کی بصارت اور بصیرت کا اندازہ لگایئے کہ انھوں نے اس موضوع کو کن استعاراتی الفاظ کی ایک ترکیب ''ادھورا اسمِ اعظم'' سے منسوب کیا ہے، یہ عنوان ہی میرے گزشتہ الفاظ کی تائید کے لیے ایک سند سے کم نہیں۔ اس نظم میں انھوں نے پورے سرمایہ داری نظام کی چیرہ دستیوں کی نہ صرف عکاسی کی ہے بلکہ محنت کش کی عظمت و اہمیت کو اُجاگر بھی کیا ہے۔ اور اسکی مسلسل بے بسی کے پسِ پردہ کرداروں کا چہرہ بھی بے نقاب کیا ہے۔ اس نظم کے اختتامی دو مصرعے انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی وہ قوت اور صلاحیت رکھتے ہیں جو رستمِ زماں بھولو پہلوان کے پاس بھی نہیں تھی۔ وہ دو مصرعے ملاحظہ کیجیے:

کسی نادیدہ برگد کا
یہاں سایہ گھنیرا ہے

احبابِ ذی وقار میں جانتا ہوں کہ آج کے مصروف ترین دور میں طوالت مضمون گراں گذرتی ہے مگر کچھ کتابیں، کچھ رائیٹرز ایسے حوالے ہوتے ہیں جن کو پڑھنا، جن پر لکھنا اور جن کے بارے میں کچھ کہنا وقت کی اہم ترین ضرورت بن کر سامنے آتا ہے اور ساتھ ساتھ لکھنے اور پڑھنے والے کی اپنی علمی اور تفہیمی استعداد میں خاطر خواہ اضافے کا سبب بنتا ہے، اور الحمد للہ! روشنی ایک حادثہ ہے اور اسکے تخلیق کار جناب واحد سراج انھی معروف حوالوں میں سے ایک ہیں۔

خدا لگتی کہوں تو اس کتاب کی ہر ہر نظم اپنے اندر ایک مکمل کتاب کا مواد رکھتی ہے مگر جناب سراج کے قلم کے کمالات دیکھیے کہ بڑے سے بڑے مضمون کو نظم کی تمام تر خوبیوں اور محاسن سے ثروت مند کرتے ہوئے تلخیص، اختصار اور اثر پزیری کے اوصاف کے مرقعے بنا کر پیش کر دیئے ہیں۔ نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی نے اردو اور ہندی کے لفظی امتزاج سے بننے والی مسحور کن فضا اور نظم کی موسیقیت سے حظ اٹھانا ہو یا ایک بہت ہی پیارے، میٹھے اور انمول رشتے کے پیچھے کارفرما جذباتِ کی شدت کا اندازہ لگانا ہو تو وہ جناب سراؔج کی ایک لوری ''جُونے دا کے لیے'' (جو انھوں نے اپنی پیاری بیٹی کیلیے بہت پہلے لکھی تھی) کا مکمل انہماک سے مطالعہ کرے۔ اگر کشائش لفظی کے کرشمے دیکھنے ہوں تو ان کی نظم ''وے بُلھیا'' پڑھ لیں جو صرف بیس الفاظ پر مشتمل ہے مگر ایک بڑے قرآنی حوالے: (نحن اقرب علیہ من الحبلا لورید) کے مفہوم کو واضح کرتی ہے۔

محبت کی حقیقت جاننا چاہیں تو نظم ''پچھل پیری'' محض بیس الفاظ میں فلسفہ کربلا کو جاننا ہو تو ان کی نظم ''راکھ سے بنتے لاکھ'' مسلم امہ کے انحطاط کی وجہ جاننا چاہیں تو ان کی نظم ''ہارتی سپہ کا سالار'' دیکھ لیں۔ اور اگر اب بھی روشنی اور تیرگی کے سمجھنے میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہو تو پھر ان کا نذرانہ محبت بنام ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا عمیق مطالعہ کریں۔ تا کہ آپ کو ایک استعاراتی فضا میں رقصاں الفاظ اور تراکیب اپنی معنوی پرتیں کھولتے نظر آئیں اور آپ کیلیڈوسکوپ کے گھومنے، موی کاغذ سے بنی سکرین، روشن خاک پر انمٹ اندھیرے، چھاتی پیٹتی چمگادڑوں کا اندھی اندھیری رات کی ہیبت کا حصہ بن جانے، کچھ سر پھرے جگنوؤں کے امیدِ صبح کی جل بجھ لیے سوادِ شب کے طول و عرض میں اُڑنے، شمشیر سے لٹکی ہوئی میزان کے نیچے کھڑے پاسبان کے سگریٹ کے کش لگانے سے ابھرنے والی سسکاری سے اس کی کج کُلاہی کے اور بڑھنے، اور پھر رنج میں لتھڑے ہوئے اس منظر کے ابھرنے کی قابل دید عکاسی جس میں سوا نیزے پر آئے ہوئے سورج کی عدالت کے کٹہرے میں ان سارے سر پھرے جگنوؤں کا کھڑا ہونا، آپ کو ایک ایسی دنیا کی سیر کراتا ہے جس کا تصور بھی کبھی نہیں کیا جا سکتا تھا مگر زمانے نے یہ سب کچھ اپنی کھلی آنکھ سے دیکھا اور سوائے تاسف اور بے بسی کے کچھ بھی نہ کر پایا۔ اور اب یہ سب استعارے اپنے انمٹ نقوش لئے ایک ایسے تمثال گر کے شاہکار کے طور پر آنے والی دنیا تک اس روشنی کی تلاش میں سرگرداں رہیں گے جس کی لو سے حق و باطل کے درمیان واضح لکیر کھینچی جا سکے اور روشنی تیرگی پر حاوی رہے۔

آخر میں جنابِ واحد سراج صاحب کو اس شاہکار شعری مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرنے کے ساتھ ہی یہ ذو اشعار بغیر کسی تبصرے کے آپکی سماعتوں، بصارتوں اور بصیرتوں کی نذر کرتے ہوئے اجازت چاہتا ہوں۔

وہ میرا ہو کے بھی میری دسترس سے باہر ہے
مجھی میں رہتا ہے اور میرے بس سے باہر ہے
وہ نور ہے تو نہایا نہیں بدن اس میں
وہ حرف ہے تو ابھی دسترس سے باہر ہے

❀❀❀

CamScanner

پانچویں موسم کا شاعر...... بیدل حیدری

بیدل حیدری کا شعر ہے:

میرے اندر کا پانچواں موسم
کس نے دیکھا ہے کس نے جانا ہے

یہ پانچواں موسم دراصل دل کا موسم ہوتا ہے جو کبھی حالات کی گرمی سے حبس زدہ ہوتا ہے تو کبھی احساس کی ٹھنڈک سے برف پوش، کبھی پر مسرت جذبات کی نرمی اسے بہار کی لطافت ادا کرتی ہے اور کبھی غم واندوہ کی بادسموم اسے خزاں رسیدہ کر دیتی ہے۔

الغرض یہ پانچواں موسم اپنے اندر جلوۂ صد رنگ لیے ہوتا ہے جن کا اظہار ہر فنکار اپنے اپنے انداز میں کرتا ہے اگر مصور ہے تو یہ اظہار کینوس پر بکھرے رنگوں کی صورت میں ہوتا ہے اور اگر موسیقار ہے تو سر اور ساز کے ذریعے دل کی بات سننے والوں تک پہنچاتا ہے اور اگر شاعر ہے تو لفظ لفظ دل کے اس پانچویں موسم کا آئینہ دار بن کر قرطاس پر ابھرتا ہے۔

عامر بن علی اسی پانچویں موسم یعنی دل کا شاعر ہے۔

لمحوں، جذبوں اور کیفیتوں کو چنیدہ لفظوں میں منظوم کرنے کا نام شاعری ہے۔ اور شاعری وہ فن ہے جو فنون لطیفہ کی ماں سمجھی جاتی ہے۔ عامر بن علی اس فن کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اور مسلسل محنت اور ریاضت کے ذریعے اس کا حق ادا کرنا بھی جانتے ہیں۔ اور کتابوں کی شکل میں تجسیم کر کے اس خداداد صلاحیت کا شکر بھی ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کی نعمتوں کا بہترین استعمال بھی اظہار تشکر کا ایک ذریعہ ہے۔ یہی محنت اور ریاضت ایک شاعر کو تعریف کے قابل بناتی ہے اور اس کا نام درخشندہ ستارے کی صورت چمکتا دمکتا ہے۔

ہر جلوۂ پرسوز کو جب دل میں بسایا
تب جا کے سخن ور ہوا تعریف کے قابل
ایسے تو کوئی اسم درخشاں نہیں بنتا
کچھ بات ہوا کرتی ہے توصیف کے قابل
(غزالہ انجم)

شاعر اس صیاد کا نام ہے جو لمحے لمحے کی اذیت، جذبے جذبے کی شدت اور کیفیت کیفیت کے رنگ کو پڑھنے کا قفس میں قید کرتا ہے۔ شاعر کا قفس عمر عیار کی زنبیل کی مانند ہوتا ہے جس میں داخلی اور خارجی احساسات کے موتی جمع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ گنج ہائے گوہر نظموں اور غزلوں کی صورت پردۂ قرطاس پر بے نقاب ہوتا ہے۔ اور یوں کتابیں تخلیق ہوتی ہیں۔

''یاد نہ آئے کوئی''، ''سرگوشیاں'' ''چلو اقرار کرتے ہیں'' اور ''محبت چھو گئی دل کو'' عامر بن علی کی وہ شعری تصانیف ہے جو ایسے ہی تخلیقی عمل سے گزر کر وجود میں آئیں۔ اور یہ تخلیقی عمل کوئی سہل نہیں اس کے لیے خون جگر صرف کرنا پڑتا ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

عامر بن علی محبت کا شاعر ہے یوں لگتا ہے محبت دل کو چھوئی ہی نہیں بلکہ رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ عامر کی ہر نظم اور ہر غزل میں محبت ایک نئے روپ میں ابھر کر سامنے آتی ہے اس دور پر آشوب میں محبت کی بات کرنا بھی اچنبھے سے کم نہیں مگر عامر بن علی نے "میرا پیغام ہے محبت جہاں تک پہنچے" کو اپنی شاعری کا منتہائے مقصود بنایا ہے جس کے لیے وہ داد کے مستحق ہیں۔ فرماتے ہیں:

کچھ نہیں مانگتے ہم تیرے سوا دنیا سے
اور ہوں گے جو کھلونوں سے بہل جاتے ہیں
سانس کی ڈور تیرے نام کی مالا ہے ہمیں
تجھ سے غافل ہوں تو ہم سوئے اجل جاتے ہیں

عامر بن علی کی نظمیں ان کے جذبات اور احساسات کی لطافت اور نزاکت سے بھرپور ہیں بڑی سادگی سے اپنی داخلی کیفیات کا اظہار کرتے ہیں فرماتے ہیں

تمہارا ساتھ
ایسا سندر تو اس جہاں میں
اور کچھ بھی نہیں

اور اسی سادگی سے دل کو سمجھاتے نظر آتے ہیں کہ

دل نہ صبور سن لے
یوں فراق میں کسی کے
تیرا اس قدر تڑپنا
تجھے بے طلب نہ کر دے

معاشرے کے دو وجود ہوتے ہیں ایک اس کا جسمانی وجود ہے جو سائنس سے پنپتا اور ترقی پاتا ہے۔ دوسرا اس کا روحانی وجود جس کے ارتقاء اور تازگی کے لیے ادب کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ ہر دور میں ادب اور ادیب ہمیشہ سے اہمیت کے حامل رہے۔ ادب اور ادیب کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ ذہن سازی کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق لفظ سے ہے اور لفظ علم الٰہی کا مظہر ہے۔ رب تعالیٰ نے کائنات کے مخفی رازوں سے پردہ اٹھایا لفظ کے ذریعے، بشر کی افضلیت قائم کی لفظ کے ذریعے، وحی اور ہدایت پہنچائی لفظ کے ذریعے۔ یعنی

ازل سے لفظ کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔

ایک شاعر کے لیے لفظ کا چناؤ انتہائی اہمیت کا حامل ہے یہی چناؤ اس کے کلام کو موء ثر اور معتبر بناتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی فرماتے ہیں کہ شعر کے ایک ایک لفظ کا چناؤ ایسے ہے جیسے ست؟ رست؟ ر کنوں میں جھانکنا۔

عامر بن علی کی شاعری میں ان کے لفظی چناؤ کے لیے محنت اور ریاضت صاف دکھائی دیتی ہے۔یہ اشعار دیکھیے

عشق والوں نے کبھی ظلم پہ بیت نہیں کی
ہم نے ہر دور کے جابر سے بغاوت کی ہے
رزم گاہوں میں کٹا کرتی ہے شاہوں کی حیات
حسن والوں نے اداؤں سے حکومت کی ہے
چاہتیں اور بھی گزری ہیں زمانے میں مگر
جیسے ہم کرتے ہیں کب کس نے محبت کی ہے

شاعر اپنے دور اپنی تہذیب اپنی ثقافت اور اپنی اقدار کا ائینہ دار ہوتا ہے۔شاعر کی سب سے بڑی خوبی راست گوئی ہوتی ہے۔یہی خوبی اسے اپنے ہم عصروں میں معتبر کرتی ہے۔

عامر بن علی کی شاعری بھی اپنے دور کی بہترین عکاس ہے اور بلا خوف سچ کا پرچار کرتی ہے یہی وہ ادا ہے جو عامر حلقہء عوام وخواص میں حق گو شاعر کا درجہ دیتی ہے۔یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

شہروں شہروں دیس میں خوف کا پہرہ ہے
کہتی ہے سرکار یہ دور سنہرا ہے
کچھ بھی تو تبدیل نہیں ہو پایا
گونگی ہے جنتا یا حاکم بہرا ہے

عامر بن علی کا خاص کارنامہ "ارژنگ" ہے۔یہ ایک ادبی ماہنامہ ہے جو اس بات کا ائینہ دار ہے کہ ہزاروں کلومیٹر دور جاپان میں مقیم عامر بن علی اپنے وطن کی مٹی سے کس قدر وابستہ ہے۔مادیت کے اس دور میں زبان و ادب کی ترویج واشاعت یقیناً ایک کارنامہ ہی تو ہے۔مزید برآں اس مہ نامے کے حوالے سے کیے گئے انٹرویوز کے ذریعے شاعروں کو نہ صرف متعارف کروایا گیا بلکہ ان تمام انٹرویوز کو ایک کتاب میں محفوظ کر دیا گیا اور ان شاعروں کو اہمیت اور عزت سے نوازا گیا اگر چہ اس حوالے سے نام نہاد ناقدین کی طرف سے اعتراضات بھی سامنے ائے جو یقیناً بے جا ہیں۔

اس سے قطع نظر میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایک دوسرے کو سراہنے اور تسلیم کرنے کا عمل ہے جو اعلی ظرفی کی مثال ہے اور یقیناً لائق تحسین ہے۔ہمارے معاشرے کی سب سے بڑی کمی ایک دوسرے کو تسلیم نہ کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم اخلاقی زوال کا شکار ہیں۔ہماری سیاست، مذہب اور معاشرت سب کی بنیاد دوسرے کی نفی پر ہے۔یہی رویہ ہمیں کسی بھی حوالے سے ترقی نہیں کرنے دیتا۔ادب کے زوال کی بھی یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی خود کو بڑا جانتا ہے اور دوسرے کو کمتر حالانکہ بڑوں نے فرمایا ہے کہ بڑا آدمی وہ ہے جس کی محفل میں کوئی خود کو چھوٹا محسوس نہ کرے۔سمجھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ انسان بذات خود کسی قابل نہیں اس کے پاس جو کچھ ہے رب کی عطا ہے تو کسی انسان کی قابلیت کو سراہنا دراصل رب کی عطا کو سراہنا ہے یہی شکر اور بندگی کا بنیادی فلسفہ ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ بشر کو تسلیم کرنا ہی تو اصل بندگی ہے ورنہ ابلیس سے بڑا توحید پرست کون تھا۔

عامر بن علی کی یہ کتاب دوسروں کو تسلیم کیے جانے کا عملی اظہار ہے اور اس عمل کے لیے میں اپ کو سلام پیش کرتی ہوں۔اللہ اپ کے زور قلم میں مزید اضافہ فرمائے آمین۔

ولی عالم شاہین/کینیڈا

وہ نقدِ شعر وہ حسنِ بیاں نہیں چلتا
دیارِ غیر کا سکہ یہاں نہیں چلتا

نہ تازگی ہے نہ خوشبو بکھرتے پتوں میں
نکل کے رنگ سے دورِ خزاں نہیں چلتا

کبھی کے ہو چکے متروک سلسلے سارے
طلسم اب بکفِ قدسیاں نہیں چلتا

خدا کا شکر ہوا اب یہ معرکہ بھی طے
سدا کہا ترا عمرِ رواں نہیں چلتا

جواب نامے چمن زار حیرتوں کے تھے
یہ سلسلہ بھی مگر جاوداں نہیں چلتا

یہیں کہیں تو مرے نقشِ پا کا مامن ہے
یہ راہ جس پہ کبھی کارواں نہیں چلتا

طویل رُت ہے زمستاں کی دن ہیں چھوٹے سے
یہاں تو سایہ تلک سایہ ساں نہیں چلتا

ہے آس پاس ہی پتوں کی ڈھیریوں میں ہوا
اتار کر کوئی بارِ گراں نہیں چلتا

غرض اب اصل سے ممکن یہ عشق سود سے ہے
یہ کاروبار بغیرِ زیاں نہیں چلتا

اُسے بس اپنی ہی آواز تھی بہت، ورنہ
پرائے روپ میں قصہ کہاں نہیں چلتا

بس اک سرور ہی کافی ہے ہم نشینی کا
سبق کے بعد یہاں امتحاں نہیں چلتا

محمود شام/کراچی

رات بھر اُس کو ہی تکتے رہنا
دن میں بھی اس کے ہی خواہاں یعنی

ممتاز صحافی اور شاعر محمود شام کے تازہ شعری مجموعے ''رقصِ یعنی'' سے انتخاب ۔۔۔ اس مجموعہ کی خاص بات ایک بحر اور ایک ردیف ''یعنی'' میں تمام غزلیں ہیں۔

تیرا ہر بات پہ کرنا یعنی
دل میں چپکے سے اُترنا یعنی

دیکھنا، سننا، سبھی کچھ پھر بھی
بھیگے ہونٹوں پہ اُبھرنا یعنی

چونک جانا کسی سرگوشی پر
زُلف کا خود ہی بکھرنا یعنی

حیرتیں خود ہی اکٹھی کرنا
آئینہ سامنے دھرنا، یعنی

ایک ہی نقطے پہ ٹھہرے رہنا
اپنی رفتار سے ڈرنا یعنی

چاند کو دیکھتے رہنا پہروں
اس کی آمد پہ سنورنا یعنی

پہلی بارش پہ نکلنا گھر سے
پیار کا حد سے گزرنا یعنی

فون کرنا بھی تو ہنستے رہنا
ہجر کی فکر نہ کرنا یعنی

شامؔ جی غور سے دیکھو اس کو
رنگ تصویر میں بھرنا یعنی

اس کے ہر جملے میں شامل یعنی
لوٹنے آئی ہے دِل وِل یعنی

لاتعلق ہیں سب اک دوجے سے
رنگ پر آئی ہے محفل یعنی

اب کوئی خواب نہیں آنکھوں میں
مل گئی ہے انہیں منزل یعنی

ان سے رشتہ ہی نہیں ٹوٹتا ہے
خوبصورت ہیں مسائل یعنی

بات بے بات اسی کی باتیں
آپ بھی ہو گئے گھائل یعنی

زندگی کیا ہے سبھی پوچھتے ہیں
عشق اس فکر کا حاصل یعنی

رقص میں جسم بھنور بنتا ہے
دیکھنا ، ڈوبنا ، مشکل یعنی

سب ہیں مقصد کے تعاقب میں رواں
کوئی تجھ سے نہیں غافل یعنی

ہے یقیں پھر بھی ہے اکثر ''یعنی''
آس اور یاس برابر یعنی

جس کی بانہوں میں تری بانہیں ہوں
وہ مقدر کا سکندر یعنی

آنکھ ملتے ہی جھکانا پلکیں
خواب رکھتی ہے بچا کر یعنی

ہر گلی تازہ لہو کی خوشبو
موت کا رقص ہے گھر گھر یعنی

لب صراحی سے لگا دیتے ہیں
کوئی خالی نہیں ساغر یعنی

اشک بہتے نہیں خوں بہتا ہے
دل ہوئے جاتے ہیں پتھر یعنی

کتنی دُنیائیں مرے ذہن میں ہیں
ایک قطرے میں سمندر یعنی

شامؔ یوں شہر مجھے دیکھتا ہے
میں ہوں مٹتا ہوا منظر یعنی

کہتی ہے پیار سے جاناں یعنی
اب تو جینے کا ہے عنوان یعنی

ہر ادا کافروں جیسی اس کی
نام کی ہے وہ مسلماں یعنی

اپنا ہر نقش مٹا دیتا ہے
عشق ہوتا نہیں آساں یعنی

رات بھر اس کو ہی تکتے رہنا
دن میں بھی اس کے ہی خواہاں یعنی

مسکراتی ہے تو جاں جاتی ہے
درد خوشیوں میں ہے پنہاں یعنی

یوں نہیں، ایسے نہیں، ویسے نہیں
عقل جذبات کا زنداں یعنی

زندگی ہے تو ملیں گے پھر بھی
اپنا کچا نہیں ایماں یعنی

بھول جاتے ہیں کبھی تجھ کو بھی
اک حقیقت غمِ دوراں یعنی

اب تو باتوں میں ہے کم کم یعنی
کھل گیا عقدۂ عالم یعنی

دیکھنے والے بھی کہہ جاتے ہیں
خود بھی حیرت ہے مجسم یعنی

جسم کھل جاتا ہے زُلفوں کی طرح
ضبطِ خواہش نہیں پیہم یعنی

اُنگلیاں جلتی ہیں چھو لینے سے
ویسے تاثیر میں شبنم یعنی

زخم بھرتی ہیں صدا کی لہریں
اس کا ہر فون ہے مرہم یعنی

ذہن کی ساری دلیلیں پھیکی
دل کی ہر بات مقدم یعنی

عشق میں ہم کو اُجڑنا ہی تھا
تیری آنکھیں بھی ہیں پرنم یعنی

CamScanner

احمد ندیم رفیع / امریکا

ہم آبلہ پا دوڑے چلے آئیں گے بے خود
بھولے سے کبھی قصدِ رفاقت ہی کرے وہ

بہار بن کے نگہ دارئ چمن میں رہے
وہ رنگ و بو جو کبھی تیرے پیرہن میں رہے
چھلک رہے ہیں وہ مثلِ نگاہِ دزدیدہ
جو لفظ چھپ کے ترے حلقۂ دہن میں رہے
یہ سوچ کر نہیں پھیری کبھی نظر تجھ سے
ترے جمال کی تاثیر میرے فن میں رہے
یہ سوچ کر تری محفل میں کی غزل خوانی
"تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے"
یہ سوچ کر ترے پہلو کا تذکرہ چھیڑا
کہ تیرے قُرب کی حدت مرے بدن میں رہے
یہ سوچ کر نہ سنوارے کبھی ترے گیسو
کہ میرا دھیان تری زلف کی شکن میں رہے
یہ سوچ کر نہیں توڑا تعلقِ باہم
کہ تیرا ذکر سدا میری انجمن میں رہے
یہ سوچ کر تجھے پہنائی خلعتِ الفاظ
کہ میرا حُسنِ بیاں تیرے بانکپن میں رہے

زیست سانسوں سے عبارت ہی سہی
اور ہر سانس قیامت ہی سہی
یہی اثباتِ حقیقت ہے مگر
آئنہ باعثِ وحشت ہی سہی
کوئی تو چیز تسلسل سے ملے
ایک بے انت مسافت ہی سہی
آ، کوئی بات پرانی چھیڑیں
ذکرِ تجدیدِ محبت ہی سہی
تیرے آنے کا گماں ہے دستک
یہ ہواؤں کی شرارت ہی سہی
اک تعلق تو رہے گا باہم
گر نہیں چاہ تو نفرت ہی سہی
جان لے لے گا کسی کی اک دن
یہ تغافل تری عادت ہی سہی
زخم بھرنے سے ہمیں کیا مطلب
لاکھ اسباب جراحت ہی سہی
شہرِ بے صوت میں جینا ہے ندیم
ہر نفس موجِ سماعت ہی سہی

موسمِ ہجر کے آداب سے نا واقف ہیں
جتنے کم ظرف ہیں، اس باب سے نا واقف ہیں
وہ کیا سمجھیں گے طلسماتِ محبت کا فسوں
جو کسی ٹوٹے ہوئے خواب سے نا واقف ہے
لبِ ساحل پہ کھڑے محوِ تماشا یہ لوگ
وسعتِ موجۂ گرداب سے ناواقف ہیں
جو مجھے غیر سمجھتے ہیں تری محفل میں
وہ ترے حلقۂ احباب سے ناواقف ہیں
روئے خنداں کی تصاویر بنانے والے
میری کیفیتِ اعصاب سے نا واقف ہیں
راحتِ وصل کے اسرار بھلا کیا جانیں
جو ترے دیدۂ کم خواب سے نا واقف ہیں
قامتِ زلف پہ قانع ہیں وہ ناداں جو ابھی
خمِ گیسو، رُخِ مہتاب سے ناواقف ہیں

چار سُو پھیلی ہوئی وحشت تھی
میرے اندر بھی وہی وحشت تھی
زندگی گزری سرِ شاخِ گل
خار ہیجان، کلی وحشت تھی
میں سمجھتا تھا محبت جس کو
چشمِ باطن میں چھپی وحشت تھی
وقت کے بہتے ہوئے دھارے میں
جو نہ گزری وہ گھڑی وحشت تھی
آمنے سامنے بیٹھے تھے ہم
درمیاں سہمی ہوئی وحشت تھی
اک تعفّن زدہ لاشے کی طرح
میرے ہمراہ مری وحشت تھی
وسعتِ امکاں کی کہانی، مت پوچھ
کبھی حیرانی کبھی وحشت تھی
مرحلہ وار صلیبوں کی طرح
رہگذاروں میں گڑی وحشت تھی
عکس در عکس کھنگالا خود کو
آئنے میں بھی وہی وحشت تھی

رنجش ہے اگر کوئی، شکایت ہی کرے وہ
اندازِ تغافل کی وضاحت ہی کرے وہ
ہم آبلہ پا دوڑے چلے آئیں گے بے خود
بھولے سے کبھی قصدِ رفاقت ہی کرے وہ
کب ہم نے کسی دستِ مسیحا کی طلب کی
اک بار مگر آ کے عیادت ہی کرے وہ
کب سے دلِ بیمار ہے محرومِ تماشا
آئے تو سہی، آ کے ملامت ہی کرے وہ
ہر حال میں اس بار منا لیں گے اسے ہم
منہ پھیر کے جانے کی شرارت ہی کرے وہ
مدت سے کوئی دل پہ قیامت نہیں گزری
لہرا کے سرِ بام قیامت ہی کرے وہ
اک حشر بپا رکھا ہے آنکھوں میں طلب نے
اس شہرِ ہوس کار کو غارت ہی کرے وہ
اظہارِ محبت میں ضروری نہیں، اے دل
ہر بات بہ اندازِ خطابت ہی کرے وہ
ہم جاں سے گئے، خیر تقاضا تھا وفا کا
دل رکھنے کو اظہارِ ندامت ہی کرے وہ
ایمان تو رہ جائے گا ہم خستہ تنوں کا
جھوٹی ہی سہی، کوئی کرامت ہی کرے وہ
ملنے کی لگن ہو تو ہزاروں ہیں وسیلے
لازم نہیں دُنیا سے بغاوت ہی کرے وہ

خاور اعجاز/راولپنڈی

برسوں سے پالا پوسا مقصود گیا
آنکھ کھلی اور سپنا باہر کود گیا
کہاں سکھاتے جا کر بھیگی پلکوں کو
سارا موسم اَب کے ابر آلود گیا
آنکھوں سے وہ برکھا برسی دل اندر
جو کچھ سینت کے رکھا تھا نابود گیا
اَن دیکھے کی خواہش لے ڈوبی ہم کو
ناموجود کی لالچ میں موجود گیا
اُس کے نام کا سکہ آخر کام آیا
مال و متاعِ دُنیا تو بے سود گیا

ہم جنوں پیشہ بس اِک تھام کے چلتے ہیں چراغ
شہر کے اہلِ خرد روز بدلتے ہیں چراغ
مہر و مہتاب بجھے رہتے ہیں جن کے اکثر
ہم فقیروں کے اُنھی لوگوں کو کھلتے ہیں چراغ
صبح کے وقت جہاں ہُو کا سماں رہتا ہے
رات ہوتی ہے تو اُس گھر سے نکلتے ہیں چراغ
گھپ اندھیرا ہی مرے حق میں غنیمت ٹھہرا
آگ لگ جاتی ہے جب شہر میں جلتے ہیں چراغ
بادِ بے مہر سے کیا ہاتھ مِلایا خاورؔ
تیرگی میں کھڑے اَب ہاتھ ہی مَلتے ہیں چراغ

بحر ہی خشک نہ کر جائیں نئی لہر کے لوگ
کے برس اور مسلط ہیں یہ دو پہر کے لوگ
ساتھ چلتے بھی نہیں راہ سے ہٹتے بھی نہیں
مری بستی میں اُمڈ آئے ہیں کس شہر کے لوگ
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ شفا کس میں ہے
کبھی تریاق کے ہوتے ہیں کبھی زہر کے لوگ
حشر کے بعد بدل جائے گا سب کچھ لیکن
رونق افروز وہاں ہوں گے اِسی دہر کے لوگ

مَیں مضافات کا شہزادہ رہا ہُوں خاور
مجھ سے جلتے ہیں اِسی واسطے اِس شہر کے لوگ

کیسے بتلاؤں کہ کیا تھا دلِ بے تاب کا حال
آنکھ کھلنے پہ کہاں رہتا ہے وہ خواب کا حال
مَیں نے پوچھا تو مرے گاؤں سے آئے ہُوئے ہنس
مجھ سے کہنے لگے مت پوچھیے تالاب کا حال
رسمِ تعظیم ہی باقی ہے نہ اَب رسمِ وفا
کیا سے کیا کر دیا اِس دَور نے آداب کا حال
لاکھ توضیحِ تلاطم کریں لیکن صاحب
عین گرداب میں ہی کھلتا ہے گرداب کا حال
تھرتھرانے لگے جب عمر کی لو ہی خاورؔ
خود سے بھی دیکھا نہیں جاتا ہے اعصاب کا حال

روئے گلاب السلام ، عزت مآب السلام
اے مرے خواب السلام، اے مرے خواب السلام
کرتا ہُوں یاد جب بھی مَیں ، دیدۂ اشکبار سے
آتا ہے بامِ عرش سے اُن کا جواب : السلام
حضرتِ عشق ! جاگیے ، دیجیے اذنِ ہمدمی
چوکھٹ پہ سر دھرے ہُوئے، مَیں ہُوں جناب! السلام
اُن کا مزاج برہمی ، اُن کی نگاہ خشمگیں
میرا کلام خیریت ، میرا خطاب السلام
کل تھے نگاہِ یار میں ، آج ہیں ہم غبار میں
دورِ حضور الوداع ، دورِ غیاب السلام

یونہی آ سکتی تھی باتوں میں روانی یہ کہاں
نہر کی بولی سے مَیں سیکھی ہے دریا کی زباں
عیش وعشرت میں کُمیداں ہُوئے ایسے مصروف
طاقِ نسیاں پہ دھری رہ گئیں شمشیر و سناں
اِس میں ظاہر ہُوئے کچھ تازہ شگوفے تو کھلا
میرے گلدان پہ تہمت تھی یہ تصویرِ خزاں

مجھے آتا ہے حریفوں کو بھی تابع رکھنا
میرا سکہ ابھی بازار میں چلتا ہے میاں
سب کو معلوم نہیں کوچۂ جاناں کا پتا
کوئی کوئی ہے جسے اذنِ رسائی ہے یہاں

میری معزولی کی رُوداد سُنا کر مجھ کو
آنکھیں دِکھلاتے ہیں اَب نوکر و چاکر مجھ کو
گھر کے سناٹے سے گھبرا کے گلی میں نکلا
ایک چُپ لے گئی انگلی سے لگا کر مجھ کو
یار تو چھوڑ گئے تھے سرِ میدانِ وفا
دشمنوں نے ہی لِیا ہاتھ بڑھا کر مجھ کو
بجھ نہ جائیں مری آنکھوں کے دِیے اے تارو!
لے چلو صبح کا اِک خواب دِکھا کر مجھ کو
جانتا ہُوں یہ مرا جشن منانے والے
قتل کر دیں گے کوئی بات بنا کر مجھ کو
مَیں گئے وقت کی نیکی ہُوں ، پلٹ آؤں گا
بھول مت جایئے دریا میں بہا کر مجھ کو
موت لے آئی مجھے باغِ عدن میں خاورؔ
زندگی تو گئی مٹی میں دبا کر مجھ کو

رات سے مشورہ کوئی ہے نہ مہتاب کے ساتھ
ہمیں تو جاگتے رہنا ہے ترے خواب کے ساتھ
ڈوب ہی جاتے جو تنکے کا سہارا ہوتا
ہم تو دریا سے نکل آئے تھے گرداب کے ساتھ
منھ لگاتے ہیں وہ کم ظرف لگے سر چڑھنے
پاؤں چھوتے تھے جو میرے ادب آداب کے ساتھ
تندیِ آب سے بستی کو بچانا ہے اگر
دوستی کرنا پڑے گی ہمیں سیلاب کے ساتھ
طعنہ زن تھے یہی آوازۂ حق پر خاورؔ
اَب جو چمٹے ہُوئے ہیں منبر ومحراب کے ساتھ

''گیت گاتا چل'' (بے مثال گائیک محمد رفیع کو خراجِ تحسین)

جنید آذر / اسلام آباد

گزشتہ ماہ (دسمبر ۲۰۲۴ء) دنیا بھر بے بدل گلوکار محمد رفیع کے چاہنے والوں نے ان کی ۱۰۰ ویں سالگرہ کی تقریبات منعقد کر کے اس عظیم گائیک کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس موقع پر کلر سیداں، راولپنڈی میں محمد رفیع کے گائے ہوئے گیتوں پر مبنی ایک کتاب ''گیت گاتا چل'' کی رونمائی کی یادگار تقریب بھی منعقد کی گئی۔ اس کتاب کے مولف و محقق وحید ریاست بھٹی ہیں۔

وحید ریاست بھٹی پیشے کے لحاظ سے بینکار ہیں۔ راولپنڈی کی تحصیل کلر سیداں سے تعلق ہے۔ صاحب مطالعہ شخصیت ہیں۔ ان کی ذاتی لائبریری میں مختلف موضوعات پر ہزاروں کتب موجود ہیں۔ موسیقی سے ان کا خاص لگاؤ ہے۔ اس موضوع پر ان کے مضامین مختلف جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ محمد رفیع کے عاشقان میں شامل ہیں اور اس عشق کا عملی ثبوت اس عظیم گائیک محمد رفیع کے فن و شخصیت پر ان کی دو اہم کتابیں ہیں:

(۱) ''اِک بنجارہ گائے'' (اشاعت جنوری 2021) یہ کتاب محمد رفیع کی زندگی اور ان کے فن کے حوالے سے نہایت اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کو 23 ابواب میں ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کل صفحات 912 ہیں۔ اس کتاب میں محمد رفیع کی زندگی کے یادگار اور اہم واقعات اور ان کے فن سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

(۲) ''گیت گاتا چل'' (اشاعت دسمبر 2024، کل صفحات 1038، اس کتاب میں محمد رفیع کے گائے ہوئے ۵۵۰۰ گیت، تمام تر تفصیلات کے ساتھ اکٹھے کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

فلم بینی دنیا بھر میں تفریح کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ ہندوستان میں فلم بینی عوام کے مزاج کا حصہ ہے۔ ایک فلم کی تکمیل میں مختلف عناصر شامل ہوتے ہیں۔ جس میں کہانی، اس کے کردار، شاعری، موسیقی جیسے اہم لوازمات شامل ہیں۔ ایک فلم کی تیاری کے لیے پروڈیوسر، ہدایت کار کے ساتھ ساتھ کہانی کار، موسیقار، تکنیکی افرادی قوت، مثلاً کیمرہ مین، فوٹو گرافر، سیٹ ڈیزائنر، ایڈیٹر، میک اپ مین، ساؤنڈ ایفیکٹ، ویژیول ایفیکٹ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

موسیقی کا شمار فائن آرٹ میں کیا جاتا ہے اور دنیا میں بے شمار لوگ موسیقی سننا پسند کرتے ہیں۔ ہندوستان میں موسیقی کی روایت ہزاروں سال پرانی ہے۔ ہندوستان کو موسیقی کی قدیم سرزمین ہونے کے ساتھ ساتھ دنیائے موسیقی کے اہم ماخذ کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ ہندوستان میں موسیقی کو معاشرے میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہندو دھرم میں اسے مذہبی عقائد کا لازمی حصہ سمجھا جاتا ہے جس کے بغیر کسی عبادت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی دنیا بھر میں پسند کی جاتی ہے۔ یوں کہیے کہ موسیقی ہندوستانیوں کے دلوں اور خون میں رچی بسی ہے۔ لوک گیتوں کی صدیوں سے مقبولیت اس بات پر شاہد ہے کہ موسیقی اس خطے کی معاشرت کا حصہ ہے۔ ہندوستانی فلم میں موسیقی ابتدا ہی سے اپنی اہمیت بنا چکی ہے۔ آپ دیکھیں کہ اپنی ابتدا سے ستر کی دہائی تک بننے والی فلموں میں شامل گیت آج بھی بہت لوگوں کے دل و دماغ پر راج کر رہے ہیں۔ ان گیتوں میں بھرپور نغمگی ہے، سرور ہے، مستی ہے، اور یہ سننے والے کو سکون دیتے ہیں۔ یہ موسیقی اپنی کیفیات میں جادو ہے جو سننے والے کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ہندوستانی فلم کی عمر ۹۳ برس ہو رہی ہے۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری کو ابتدا ہی سے بہت قابل موسیقار میسر آئے جنہوں نے فلمی سچویشن کو سامنے رکھتے ہوئے ناقابل فراموش دھنیں تخلیق کیں۔ ابتدائی موسیقاروں میں انل بسواس، حسن لال بھگت رام، پنکج ملک، آر سی بورال، کھیم چند پرکاش اور سجاد حسین وغیرہ نے فلمی صنعت میں موسیقی کے پاؤں مضبوط کیے۔ ان کے بعد نوشاد علی، غلام محمد، شنکر جے کشن، ایس ڈی برمن، او پی نیر، سی رام چندر، مدن موہن، خیام، ہنس راج بہل، سلیل چودھری، وسنت دیسائی، ہیمنت کمار، روشن، ناشاد، چتر گیت، آر ڈی برمن، لکشمی کانت پیارے لال نے لازوال دھنیں تخلیق کیں آئے۔ ان کا ساتھ ایسے باکمال گیت نگاروں نے دیا جو ہر طرح کی کیفیات کو اپنی شاعری میں ڈھال سکتے تھے۔ سب سے بڑھ کر ایسے گلوکار سامنے آئے جنہوں نے موسیقی کی تاریخ میں اپنے آپ کو امر کر دیا۔ کے ایل سہگل، پنکج ملک، محمد رفیع، منا ڈے، مکیش، طلعت محمود، ہیمنت کمار، سی ایچ آتما، کشور کمار اور مہندر کپور سرفہرست ہیں۔ وہیں خواتین گلوکاروں میں لتا منگیشکر، آشا بھوسلے، گیتا دت، شمشاد بیگم، ثریا، نور جہاں اور مبارک بیگم اہم ہیں۔ محمد رفیع نے فلمی دنیا میں اپنے کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں۔ انمول گھڑی سے اپنے کیریئر کا آغاز کرنے والے محمد رفیع نے ہر رنگ اور ہر موڈ کے گانے گائے ہیں۔ فلم انڈسٹری کے لیے محمد رفیع کی آواز کسی نعمت سے کم نہ تھی۔ وقت کے نامور موسیقاروں نے ان کی آواز کو قدرت کا انمول تحفہ جان کر اپنی لازوال دھنوں کے لیے استعمال کیا۔ ''گیت گاتا چل'' میں جناب وحید ریاست بھٹی نے کمال کام یہ کیا کہ انہوں نے اس مقبول اور ہر دلعزیز گلوکار کے گائے ہوئے گیتوں کو دستاویزی شکل میں یکجا کر کے محمد رفیع کے چاہنے والوں کو ایک انمول تحفہ دیا ہے۔ تحقیق و ترتیب کوئی آسان کام نہیں چونکہ میرا اپنا رجحان بھی اس طرف ہے۔ اس لیے مجھے ان مسائل کا ادراک ہے جو ایسے کام کے دوران پیش آتے ہیں۔ یہ بڑی باریک بینی اور دل جمعی سے کیا جانے والا کام ہے۔ کیونکہ تحقیق ایک دقت طلب عمل ہے اس لیے بہت سے محققین بیچ رستے میں رہ جاتے ہیں۔ وحید ریاست بھٹی نے نہایت محنت، دل جمعی اور لگن کے ساتھ محمد رفیع کے گائے ہوئے گیتوں کی جمع آوری کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ وحید ریاست بھٹی نے اس کتاب میں محمد رفیع کے فن اور شخصیت پر اتنی جامع تحقیق اور معلومات کو اکٹھا کر کے محمد رفیع کے فن کے حوالے سے مزید کوئی گنجائش نہیں چھوڑی، اب صرف انہی باتوں کی دہرائی ہی کی جا سکتی ہے جو فاضل مصنف اس میں فراہم کر دی ہیں۔ انہوں نے محمد رفیع کے نئے پرانے سبھی گیتوں کو تلاش کر کے اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔ اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ نہ صرف عاشقانِ محمد رفیع بلکہ ایک عام قاری اور اس موضوع پر کسی بھی قسم کی مزید تحقیق کرنے والوں کے لیے بھی یہ کتاب یکساں دلچسپی اور اہمیت کی حامل ہے۔

افتخار شفیع کی شاعری میں حرفِ معتبر کی تلاش

ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی/ملتان

داستانوں کی بلاغت افتخار
ایک حرف معتبر میں قید ہے

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت، یہ سب داستانوں کی بلاغت کے وسیلے ہیں، مصور نے زندگی کی داستان کو رنگ کے انگ میں پیش کیا۔ عمارت گر نے اپنی صنعت کی روپ کتھا کو خشت کی زبان میں سنایا۔ مجسمہ ساز نے پتھر کا سینہ چیر کر اپنے تصور کی اساطیر کی تجسیم کی۔ موسیقار نے اپنی کہانی کا ابلاغ ساز و آواز کے ذریعے کیا اور شاعر و ادیب نے حکایتِ ہستی حرفوں میں ڈھال کر بنائی۔ شعر و ادب کی دنیا میں لکھے ہوئے حرفوں کو، بولے ہوئے حرفوں کی نسبت زیادہ معتبر سمجھا گیا۔ اس لئے شاعروں، ادیبوں نے محض حکایت گوئی اور داستان طرازی پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ داستان نویسی کو ذات اور کائنات کی تقسیم کا وسیلہ بنایا۔ پھر یہ ہوا کہ بارگاہ ادب میں، عقل آستاں سے دور نہ ہوتے ہوئے بھی، حضوری کے مرتبے تک نہ پہنچ سکی اور شاعری کو باریابی کا شرف حاصل ہو گیا۔ دربار میں شعر کو پہلی صف میں جگہ دی گئی۔ شاعری کے اعتبار اور استناد کا اندازہ ول دوراں (Will Durant) کے ان الفاظ سے کیجیے:

''دیوتا مر جائیں گے لیکن ملکۂ سخن لازوال ہے وہ موت سے بھی زیادہ طاقتور ہے''

یہی سبب تھا کہ حرف وہی معتبر ٹھہرا جو شعر کے قالب میں ڈھلا۔ حرف اور شاعری کا یہ رابطہ اس درجہ استوار ہوا کہ حرف کو شاعری کے مترادف گردانا گیا۔ ہر دور کے شاعر، حرف معتبر کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ بلاغت کلام کے لیے مناسب لفظوں کی تلاش کے بارے میں ایک نقاد نے کہا:

''شاعر ایک ایک لفظ کی تلاش میں رات رات بھر جاگتا ہے جب کہ پرندے اور مچھلیاں تک سوتی ہیں''۔

حرف معتبر کی جستجو آج بھی جاری ہے۔ ہمارا شاعر افتخار شفیع بھی "نیلے چاند کی رات'' میں حرف معتبر کو تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے وہ جانتا ہے کہ داستانوں کا مکمل ابلاغ حرف معتبر ہی کے وسیلے سے ممکن ہے۔ یہیں ایک اہم نکتے کی نشان دہی ضروری ہے کہ جس طرح گلے سے نکلی ہر تان، ساز سے نکلی ہر دھن، تیشے سے لگائی ہر ضرب اور موقلم سے بنایا ہر نقش معتبر نہیں ہوتا۔ اسی طرح قلم سے تراشا ہر شعر بھی حرف معتبر نہیں ہوتا۔ حرف وہی معتبر ہوتا ہے جو اثر اور ابلاغ کے ہر دو معیار پر پورا اترے۔ افتخار شفیع کی شاعری میں ہمیں حرف، اعتبار کی منزل کی طرف رواں دواں نظر آیا ہے۔ اس نوجوان تخلیق کار نے پوری کوشش کی ہے کہ اس کے شعر میں بلاغت اور اثر آفرینی کی آمیزش احتیاط، توازن اور تناسب سے ہوتا کہ اس کی داستان کو لوگ دلچسپی سے سنیں اور آسانی سے سمجھ سکیں۔

افتخار شفیع نے شعری فضا میں استعجاب اور تحیر کی کیفیت پیدا کر کے اپنی شاعری کو اثر سے مربوط اور جدیدیت سے ہم آہنگ کیا ہے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جدید دور کی شاعری میں معروضی حقائق اور عصری تقاضوں کا سائنٹیفک اظہار ہوتا۔ لیکن ہوا یوں کہ آج کے شاعروں نے میٹافزکس کے عناصر کو دونا کیا۔ افتخار شفیع نے بھی مابعد الطبیعاتی ماحول پیدا کر کے ایک طرف اپنی شاعری کو حیرت کدہ بنایا ہے تو دوسری طرف ہمارے اندر کے تصور پرست انسان کو مرنے سے بچالیا ہے اس نے تحیر کی تخلیق کے لیے کبھی یاد ماضی کے دھندلکوں کا سہارا لیا ہے تو کبھی مستقبل کے امکانات کے ہیولوں کا۔ دونوں صورتوں میں وہ حیرت کا سماں پیدا کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ افتخار شفیع بھی ہمیں ایسی زمینوں میں لے جاتا ہے جنھیں شاید کبھی خواب میں ہم نے دیکھا تھا۔ وہ ہمیں ایسے زمانوں میں لے جاتا ہے جنھوں نے شاید کبھی ہمارے لاشعور میں نشو و ارتقا کے مدارج طے کیے تھے۔ وہ بھی ہمیں ایسے لوگوں سے ملواتا ہے جن سے ملنے کی طلب شاید ہمیشہ سے ہمارے قلب کی گہرائیوں میں دفن تھی اور کبھی ایسے فطری مناظر ہمیں دکھاتا ہے جنھیں شاید ہم اپنے اندر کے بدلتے موسموں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہے تھے۔ اس عجیب و غریب دنیا میں پہنچ کر نہ جانے کیوں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم عافیت کی بانہوں کے حصار میں ہیں۔ جہاں امن ہی امن ہے جہاں سکون ہی سکون ہے۔

جنوری کی سرد شامیں گاؤں کا اک ٹی سٹال
گاڑیوں کے آنے جانے کی صدا، میں اور تو

آتا ہے یاد آج بھی ماضی کی اوٹ میں
کچے سے اک مزار کا رستہ عجیب سا

سرد کہر میں لپٹے برگروں کے لاشے تھے
سادھوؤں کے ڈیرے کا رنگ ہی نرالا تھا

پھر ڈھل کے سسکیوں میں اچانک بکھر گیا
دریا کنارے ایک وہ نغمہ عجیب سا

بکھری پڑی ہیں آج بھی اس پر کہانیاں
ٹیلا جو ریت کا مرے گاؤں سے دور ہے

میں سمجھ لوں گا کوئی سانحہ باقی ہے ابھی
مجھ کو پاتال سے رونے کی صدا آنے دے

ہوا نے اکثر جو آ کے صحرا میں گنگنایا
وہ گیت کس کا لکھا ہوا ہے کسے خبر تھی

سوچتا ہوں بعد اس کے اور کیا رہ جائے گا
قہقہہ اک وادیوں میں گونجتا رہ جائے گا

ساحلوں کے پاس لوگوں کا ہجوم بے کراں
شام کی دہلیز پر اک واقعہ رہ جائے گا

CS CamScanner

آج کے نوجوانوں کو روایت شکن اور ماضی فراموش کہا جاتا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ جوان خون کی حرکت کا رخ ہمیشہ آگے کی طرف ہی رہتا ہے۔ مڑ کر پیچھے دیکھنا نئی نسل کا شعار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگ ہمارے جوانوں کی فکر کو بے سمت رویہ اوران کے عمل کو بے لگام بغاوت قرار دے کران سے برات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ سوچ کا یہ انداز سماجی فضا میں موجود ضرور ہے لیکن اس کی تعمیم سراسر زیادتی ہے۔ ماضی کی روایات سے انحراف اور اقدار سے بغاوت کا لیبل پورے نوجوان طبقے پر نہیں لگایا جا سکتا۔ افتخار شفیع اپنی شاعری میں ایسا نوجوان نظر آتا ہے، جسے اجداد کی اقدار سے پیار ہے، جسے انسانی رشتوں کی پہچان اوران کی حرمت کا احساس ہے، جس کے ذہن پر راہِ عدل کے ان مسافروں کے قدموں کے نقش مرتسم ہیں جو تاریک راہوں میں مارے جانے کے باوجود امر ہو گئے۔ افتخار شفیع کو نئی نسل کا رکن ہونے کے باوصف پرانی چیزوں سے اتنا پیار ہے کہ ہجرت کے وقت بھی وہ اپنے سامان میں بوسیدہ کتابیں رکھنا نہیں بھولتا۔

اک عمر گزاری نے آہنگ سے لیکن
اجداد کی اقدار کو بھی دھیان میں رکھا
مرا بھائی مرے اوپر ہمیشہ چھاؤں رکھتا ہے
میرے سر پر قیامت، یہ شجر آنے نہیں دیتا
دنیائے بے ثبات سے ہو کر امر گئے
اپنی بقا کے واسطے کچھ لوگ مر گئے
وہ افتخار جن کی مہک تھی وجود میں
باسی تھے کس دیار کے، جانے کدھر گئے

پھر آشوب نگر کا باسی ہونے کے باوجود افتخار شفیع کہیں بھی ''اینگری ینگ مین " نہیں لگتا کیونکہ اسے یقین ہے کہ ظلم کی یہ مہیب تاریکی بہر حال چھٹ جائے گی، اور محرومیوں کی یہ اذیت ناک گھڑی بہر طور کٹ جائے گی۔ وہ اپنے دل میں ہر دم اس کا دیا جلائے رکھتا ہے، وہ اپنے ہاتھ میں ہر آن زیتون کی شاخ تھامے رکھتا ہے۔ سورج کی ایک کرن ہی اس کی آنکھوں میں حسین رتوں کے خواب بھر دیتی ہے۔ بارش کی ایک بوند ہی اس کے اندر کے موسم کو سہانا بنا دیتی ہے نوجوان شاعر کا یہ رجائی انداز اس کی شاعری کی زیبائی اور رعنائی میں اضافہ کرتا ہے۔

کسی صورت وہی پہلا نظارہ ساتھ لے آنا
جب آؤ تو سمندر کا کنارہ ساتھ لے آنا
سفر تو شب کا لمبا ہے تم اتنا کام کر دینا
کوئی جگنو، کوئی روشن ستارہ ساتھ لے آنا
آؤ نکلیں شام کی ٹھنڈی سڑک پر افتخار
زندگی کچھ تو اپنا رابطہ رہ جائے گا
جن پر صدیوں تاریخی کا راج رہا ہے
سورج ان رستوں سے گزارا جا سکتا تھا

ایک فلسفی نے کہا تھا، ''اس حکمت سے کیا فائدہ جو ہمیں حسن سے محبت کرنا نہ سکھائے گویا حسن سے محبت کے بغیر، حکمت ایسی اعلیٰ قدر بھی بے سود شے ہے۔ یہ فلسفی ایک اور جگہ لکھتا ہے۔ ترنم، محبت سے وابستہ ہو کر نغمہ، رقص اور شاعری کی تخلیق کرتا ہے گویا محض غنائیت، موسیقیت، بحر، وزن، اور آہنگ کی لڑی میں لفظوں کو پروئے چلے جانا ہی شاعری نہیں۔ صرف حکمت کی باتوں کو شعر کے قالب میں ڈھالتے جانا ہی سخن وری نہیں بلکہ شعر تر اور حرف معتبر کے لیے محبت کا لمس بھی ضروری ہے۔ افتخار شفیع کی شاعری میں محبت کے اس دل ربا لمس کو محسوس کیا جا سکتا ہے ان کے شعروں سے اس کی حسن سے محبت کی کہانی کو آسانی سے مرتب کیا جا سکتا ہے۔ محبوب سے پہلی ملاقات، حسن وعشق کی واردات اور پھر بچھڑنے کے لمحات کو شاعر نے نہایت دل کش انداز میں پیش کیا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کی محبت میں کہیں بھی دیوانگی اور وارفتگی نہیں، ہر جگہ عشق کے آداب میں قرینہ اور سلیقہ، محبت میں ہر گام پر احتیاط اور رکھ رکھاؤ ہے، محبت کے اس انوکھے انداز نے شاعر کو گریباں چاک عاشق ہونے سے بچالیا ہے اور ہمیں اس روایتی مجنوں کی دید سے محفوظ رکھا ہے جسے لیلیٰ تک پہنچنے کے لیے سگ لیلیٰ تک بہر طور پیار کرنا پڑتا ہے۔

کھلنے لگے خیال کے صحرا میں سرخ پھول
تم سے ملی نگاہ، تو منظر نکھر گئے
میرے بھی خدو خال اچانک بدل گئے
وہ بھی مرے وجود کے اندر بکھر گیا
آیا تھا اک خیال سا میرے بھی ذہن میں
اس نے بھی کچھ کتاب لکھا عجیب سا
مرزا غالب کی غزل کا اک انوکھا جائزہ
شاعری پر گفتگو کا مرحلہ میں اور تو
میرا اس کا رابطہ، ایک لمحے کا فراغ
میری اس کی داستان، ایک مٹی کا چراغ
اس کو معلوم کہاں، کیسے بچھڑتا ہے کوئی
وقت رخصت کی روایات سمجھتا ہی نہیں
بادلوں کا دھرتی سے روٹھ کر چلے جانا
آپ کے بچھڑنے کا معتبر حوالہ تھا

افتخار شفیع نے غزل کی طرح اپنی نظم میں بھی حرف معتبر کی تلاش کا عمل جاری رکھا ہے۔ یہ ہئیت کے اعتبار سے آزاد نظمیں ہیں جن میں شاعر نے فن کارانہ انداز میں نئے اور اچھوتے موضوعات کو دل کش پیکر دیے ہیں۔ ان نظموں کی فضا میں تحیر واستعجاب بھرا ہوا ہے۔ یہ نظمیں حسن کی غماز اور رومان پرور مناظر کی عکاس ہیں۔ ان میں شاعر کی ذات بھی ہے، فطرت اور کائنات بھی۔ ان میں زندگی کے مسائل بھی ہیں اور عدم کی بات بھی۔ یہ نظمیں جہاں جوان شاعر کے لیے بے نیاز جذبوں کا بے تکلف اظہار ہیں، وہاں ان کے وسیلے سے شاعر کے سنجیدہ خیالات کا بلیغ اشاریہ بھی تیار کیا جا سکتا ہے۔ یہاں چند نمائندہ نظموں کا تجزیاتی مطالعہ افتخار شفیع کے شعری رویے کی تقسیم میں معاون ثابت ہوگا۔

CamScanner

نظم ''فورٹ منرو میں'' ہمیں حیرت میں ڈوبی عجیب سی رومانی فضا میں لے جاتی ہے۔ شاعر پہاڑی علاقے میں ایک غیر ملکی عورت ماڈا یولائن کی قبر پر کھڑا ہے اس قبر پر شاعر اور اس کی محبوبہ کے نامکمل دستخط ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں بھی اس مقام پر آئے تھے۔ پھر وہ چشم تصور سے گلابی شال میں اپنی محبوبہ کو دیکھتا ہے، جو پہاڑی کے کٹیلے پتھروں پر چل رہی تھی۔ کبھی وہ دونوں اس خنک اور خاموش رومانوی ماحول میں نشیلی گھنٹیوں کی کانوں میں رس گھولتی آواز سنتے تھے۔ کبھی یہاں دو دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے، کبھی انھوں نے اس قبر پر دستخط کر کے اپنے بندھن کے اٹوٹ ہونے کا خاموش اعلان کیا تھا، لیکن اب اس خوب صورت فضا میں محبوبہ کہیں نظر نہیں آتی۔ یہاں بس اس کی یاد ہے جو شاعر کے ماضی اور اس کے رومان کا معتبر حوالہ ہے۔ یہ نظم بہ ظاہر ایک واقعہ سے مربوط ہے۔ تاہم اس میں شاعر نے اپنی محبت اور فراق دونوں کو خوب صورتی سے مصور کیا ہے۔ اپنی محبت کی تصویر کے لیے اس نے ایک دل آویز پس منظر بنایا ہے:

مگر وہ کون ہے
جو سارے ان پس منظروں میں
مری نظموں سے بڑھ کر بولتی ہے
کہ جس کی دودھیا سی قبر پر اب
تمہارے اور میرے نامکمل دستخط ہیں

دودھیا قبر پر نامکمل دستخط دراصل شاعر کی ادھوری محبت کی علامت ہیں۔ شاعر اب اپنی محبوبہ کو دودھیا قبر اور اس پر ثبت نامکمل دستخط کے حوالے سے یاد کرتا ہے یہی یاد اب اس کی زندگی کا حاصل ہے اور اس کی یاد اندر چھپے آئیڈلسٹ فن کار کے لیے نت نئے Images کی تشکیل اور نظموں کی تخلیق کا قوی وسیلہ ہے۔ جب روم کے بادشاہ سیزر کے جگری دوست بروٹس نے بھی سیزر کے سینے میں خنجر اتارا تو سیزر کے منہ بے اختیار نکال "You too, Brutus"۔ اس ڈرامائی اور تاریخی فقرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے۔ افتخار شفیع نے نظم You Too میں مرد کے ہرجائی پن پر گہری طنز کی ہے۔ مرد جو محبت کے آغاز میں گرم جوشی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اپنی روح کے خلا کو پر کرنے کے لیے محبوب کی قربت کو زندگی کا آخری سہارا سمجھتا ہے۔ اس کا ساتھ ہمیشہ نبھانے کی قسمیں کھاتا ہے لیکن مطلب نکل جانے کے بعد محبوب سے گریزاں ہو جاتا ہے۔ ایسے میں محبوب کے لبوں پر ''تم بھی بروٹس نکلے'' کے الفاظ کا آنا فطری معلوم ہوتا ہے اصل میں مرد کے پاس محبوب سے وصل کے لیے کوئی جواز ہو یا نہ ہو۔ اس کے پاس فراق کے بے پناہ بہانے ضرور ہوتے ہیں۔

ایک وقت آتا ہے جب اس کی یادوں کی الماری میں لٹکا ایک اک ہینگر اس کے ضمیر کا بوجھ بن جاتا ہے۔ پچھتاوا اس کے ماتھے پر چپک جاتا ہے اور خود اذیتی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں حرارت اور حرکت نہیں ایک جمود ہے اور وہ ایسے برزخ میں معلق ہے، جہاں سے فرار ممکن نہیں۔ نظم ''نیا ایکسل کا خیال جرمن ادب سے لیا گیا ہے۔ Axil ایک جرمن شہزادہ تھا جس نے محبت کے حصول کے بعد خوشی کا اظہار خودکشی کی صورت میں کیا تھا۔ اس نظم میں خواہش کے جنگل میں گم اور حرص و ہوس کی دلدل میں پھنسے ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنی خواہشوں ہی کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ ہر سٹیج پر ایکسل کا کردار بار بار دہرایا جاتا ہے۔ لوگ شہر ہول اور آفت زدہ ماحول میں ہر روز موت کا وحشیانہ رقص دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی "طول امل" سے گریز نہیں کرتے۔ ہر خواہش کی تکمیل کے لیے وہ ہر جتن کرتے ہیں لیکن آرزوؤں کی تکمیل سے پہلے ہی ہستی ناپائیدار انھیں دم دے جاتی ہیں۔ شاعر نے اس Madding Growd کی موت کو خودکشی کہا ہے، اس نظم کی زبان اور فضا ڈرامائی ہے اور شاعر نے حرص زدہ زندگی کی رائیگانی کو ایک اسطورہ کے حوالے سے اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔

افلاطون کے نزدیک انسانی جسم روح کا قید خانہ اور قبر ہے یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اس جنس میں مقید کر دئے گئے ہیں کیونکہ ہر قسم کا شر، فتنہ و فساد اسی وجہ سے ہے۔۔۔ حقیقی نجات تو موت ہی سے ممکن ہے"۔

نظم ''گردش'' انسان کے صدیوں کے گم نام سفر کی کہانی ہے۔ شاعر کے نزدیک زمین پر انسانی وجود کا سفر دراصل عدم کی منزل تک جانے کے لیے جبری حرکت ہے۔ انسان اس کائنات کا مرکز و محور ہونے کے باوجود مجبور محض ہے، اختیار اور اعتبار اس کے بس کی بات نہیں۔ انسانی زندگی ایک ایسا Vicious چکر ہے جس سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔ یہ ایک ایسی دیوانہ وار گردش ہے جس کی انتہا بہر حال لاحاصلی پر ہوتی ہے اور موت سے پہلے اس چکر سے نکلنے کی کوشش عبث ہے۔ ''نیلے چاند کی رات'' ایک سادہ سی رومانوی نظم ہے جس میں شاعر نے رات کے سارے مناظر کو محبوبہ کی نیلی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہاں آنکھ سے مراد نقطہ نظر اور انداز فکر ہے۔ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ جس طرح نیلی آنکھیں ماحول کی ہر شے کو میلا دکھاتی ہیں۔ اسی طرح ہر فرد اشیاء و اشخاص، ماحول و معاشرت کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے گویا اصل شے ظاہر نہیں، انسان کی باطنی آنکھ ہے جو چیزوں کو خاص تناظر میں دیکھ کر ان کی ہیئت، ان کے رنگ کا تعین معروضی نہیں، موضوعی انداز میں کرتی ہے۔

❀❀❀

CS CamScanner

سندھی لوک گیت

مرزا کاظم رضا بیگ

لفظ ''گیت'' سنسکرت کے مصدر ''گنی'' سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں گانا۔ لہٰذا گیت سے مراد وہ خاص نظم ہے جو باقاعدہ لے، سُر اور تال میں گائی جا سکے اور گیت کے لیے اس کا گایا جانا شرط ہے اس لیے یہ ہلکا پھلکا اور مختصر سا ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ نرم و نازک، شیریں اور لوچدار ہوتے ہیں۔ بندش سیدھی سادی، معنوی پہلو کی نسبت صوتی پہلو زیادہ نمایاں، ہر مصرع ایسا کہ سنتے ہی سمجھ میں آ جائے، ایک بھی مبہم اور پیچیدہ مصرع سارے گیت کی خوب صورتی اور لطافت کو تباہ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ گیت کا مضمون بھی بہت گہرا، از حد فلسفیانہ اور خشک نہیں ہونا چاہیے۔ سارے گیت میں ''تھل'' یعنی مطلع سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے اور اسی تھل پر پورے گیت کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اسی تھل سے گیت کی یک جہتی قائم رہتی ہے۔ اسے ایک دھاگا سمجھیے جو بکھرے ہوئے مصرعوں یا بندوں کو ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے ایک مالا میں پروئے رکھتا ہے۔ موسیقی کے نقطہ نظر سے بھی تھل کا مصرع بہت ہی اہم ہوتا ہے۔

بعض لوگ موضوع کے لحاظ سے گیت کے دائرے کو بہت ہی محدود کر دیتے ہیں۔ وہ اسی چیز کو گیت کہتے ہیں، جس کا موضوع صرف حسن و عشق ہو۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ گیت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے داخلی انداز نظر۔ چنانچہ مندرجہ بالا ہیئت کو جو بھی گائی جانے والی نظم انسانی قلب کے لطیف جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہے، اسے ہم گیت ہی کہیں گے۔ اس طرح گیت کے موضوعات، حسن و عشق کے علاوہ مذہب، اعتقاد، روحانیت، رزم و بزم، عشق و محبت، ہجر و فراق، شادی بیاہ، رسومات، مقامات وغیرہ بھی ہیں اور اس کی متعدد اقسام بھی ہیں جن کا ذکر ذیل میں پیش خدمت ہے۔

مولود: سندھی میں مولود اپنے لفظی معنی کے اعتبار سے حضور ﷺ کی ولادت کے بارے میں خوشی کے اظہار کا مظہر ہے لیکن آگے چل کر مولود کی حیثیت سو فیصد نعت کی سی ہو گئی اور اس میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور سیرتِ طیبہ سے متعلق تمام باتیں تفصیل سے کی جانے لگیں۔ مولود سندھی شاعری کی ایک مقبول صنف بھی ہے۔ اس کے علاوہ مولود کے ساتھ مدح بھی پڑھی جاتی ہے۔

مولود کی گائیکی کا انداز بھی منفرد ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد قرأت اور انشاء کی طرز پر ہے۔ کلاسیکی موسیقی کا بھی اس میں دخل ہے۔ ایک سے زائد پڑھنے والے دو دو ٹولیوں میں بیٹھتے ہیں۔ ہر ٹولی میں عموماً چار یا چھ آدمی ہوتے ہیں۔ مخدوم عبدالرؤف بھٹی ہالائی (1682-1752ء) ایک مشہور مولود گو شاعر تھے۔ ان کے موزوں کردہ کلام وائی، کافی کی ہیئت میں بھی ہیں اور علم عروض پر غزل نما بھی۔

مدح: سندھ کے لوک اور عوامی شعراء نے رسول اکرم ﷺ اور دیگر اسلامی اکابرین، اولیائے کرام اور صلحائے عظام کی مدح سرائی کی ہے۔ آنحضرتؐ کے علاوہ سندھ میں حضرت پیران پیر شاہ عبدالقادر جیلانی کی مدح میں بھی کافی سندھی کلام موجود ہے۔ اس صنف میں جو مواد دستیاب ہوا ہے وہ دور کے لحاظ سے سترہویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے کا ہے اور جو پہلا مستند شاعر نظر آتا ہے وہ ہے جمن چارن جو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے معاصروں میں سے تھا اور شاہ صاحب سے چودہ سال پہلے 1151ھ میں انتقال کر گیا۔

مناجات: یہ صنف بھی مدح کی طرح ایک اعتقادی اور مذہبی صنف ہے۔ اس صنف میں سائل اپنی نجات کی التجا کرتا ہے۔ آنحضرتؐ اور اولیائے کرام کے حضور ایک نذرانہ عقیدت اور ان سے نجات کے لیے درخواست ہے۔ دور کے لحاظ کے یہ صنف بھی مدح کی ہم عصر ہے۔

معجزہ: انبیاء کے معجزوں کے بیان کے لیے سندھی شاعری میں ایک صنف مخصوص ہے۔ سندھی میں اس کا آغاز غالباً اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اس عہد کے معجزے سندھی ادب میں آج بھی دستیاب ہیں۔

مناقبہ (منقبت): مدح، مناجات، معجزہ اور مولود کا نعم البدل مناقبہ بھی مذہبی شاعری کی ایک اہم صنف ہے اور اپنی مقبولیت کی بنا پر یہ زبان زد خاص و عام ہے۔ اس میں حضورؐ اور دیگر مشاہیر اسلام کے متعلق تعریفی کلام کہا گیا ہے۔

جاگو: جاگو کے لفظی معنی ''جاگ جاؤ'' کے ہیں، جبکہ اصطلاح اور موضوع کے وسیع تر معنی میں یہ ایک ایسی صنف سخن کا نام ہے جو رمضان المبارک میں سحری کے وقت روزہ داروں کو جگانے کے لیے بڑی خوش الحانی سے گائی جاتی ہے۔ جاگو مفہوم کے لحاظ سے حمد و ثنا اور خدا کی وحدت کا ذکر کرنے کی شاعرانہ صنف ہے۔ اس میں نہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی ثنا خوانی ہوتی ہے، بلکہ اس میں احکام خداوندی کی تشریح اور ان کی طرح راغب ہونے کی تلقین بھی ہوتی ہے۔

ہو جمالو: یہ سندھ کا قدیم گیت ہے جو سندھ کے لوک گیتوں میں زیادہ مشہور ہے اور ثقافتی طائفوں میں گائے جانے کی وجہ سے دنیا کے دیگر خطوں میں بھی اسے شہرت و مقبولیت حاصل ہے۔ ہو جمالو کسی شخص کے لوٹ آنے پر خوشی کے اظہار کے طور پر گایا جاتا

ہے۔اس گیت کے بولوں سے پتہ چلتا ہے کہ جمالو (ایک نام) ذریعہ معاش کی تلاش یا کسی دوسری بنا پر لاڑ (زیریں سندھ) چلا جاتا ہے اور جب وہ واپس لوٹتا ہے تو اس خوشی کے موقع پر جمالو گایا جاتا ہے۔ جمالو گانے والوں میں شامل لوگ ہو جمالو کی تھاپ پر گاتے ہیں، جبکہ درمیانی بول صرف ایک شخص کہتا ہے۔ گیت کے کافی بول ایسے بھی ہیں جو بعد میں شامل کیے گئے ہیں۔

لولی: یہ بالائی سندھ کا مقبول لوک گیت ہے۔اس کے بول زیادہ تر اُونٹوں کے قافلوں کے سفر اور واپسی کے متعلق ہیں۔لولی کے بول اکثر سرائیکی میں ہیں جو سندھ میں یکساں مقبول ہیں۔

مورو: سندھ کا یہ لوک گیت زیادہ تر کوہستانی علاقے میں گایا جاتا ہے۔اس صنف کے موضوع عام طور پر محبت و مجاز پر مشتمل ہوتے ہیں۔ دیہاتی زندگی کے خدوخال اس میں نمایاں ہیں۔

چھلو: یہ لوک گیت اُنگلی میں پہنے جانے والے چھلے سے متعلق ہے۔ سندھی کے علاوہ سرائیکی اور دیگر زبانوں میں بھی یہ لوک گیت عام ہے۔ محبت کی واردات بیان کرنے کے لیے چھلے کو حوالہ بنایا گیا ہے۔

بیلن: یہ لوک گیت دو ہم قافیہ مصرعوں کی بنا سے بیلن کہلاتا ہے۔ اس گیت کو جنگل کے باشندے یا ساربان اکثر گایا کرتے ہیں۔ محبت کی واردات کا بیان اس لوک گیت کا بنیادی مضمون اور حسن ہے۔اس کے زیادہ تر بول سرائیکی میں ملتے ہیں۔

مانجھیڑو: مانجھی کشتی چلانے والے ملاح کو بھی کہا جاتا ہے۔اس لوک گیت سے مانجھی کی کیا نسبت ہے، اس کا کوئی پس منظر موجود نہیں ہے اور نہ ہی بولوں سے کوئی نسبت معلوم ہوتی ہے۔

ہمرچو: جس طرح بالائی سندھ کے کچھ مخصوص لوک گیت گامن، موڈی اور ڈولو وغیرہ ہیں، اسی طرح تھر پارکر کے ریگستانی علاقے میں بھی کئی مقبول گیت ملتے ہیں۔ ان میں سے متعدد گیت سندھی زبان میں ہیں اور باقی گیت ڈھاٹکی اور جیسلمیری زبانوں میں ملے جلے ہیں۔ ان میں مشہور گیت ولاڑو، ڈاٹیڑو، جودھیو، کرہیو، ہاسل، گولاڑو، کجلیو مگر یواڈن اور ورسارو وغیرہ اہم ہیں۔

ہمرچو کا اصل خطہ بھی تھر ہے، لیکن اپنی مقبولیت کے باعث یہ لوک گیت پورے سندھ کے ہاریوں میں مقبول ہے اور کام میں مصروف محنت کشوں کا گیت بن چکا ہے۔ ہمرچو ''ہمراہ چو'' کا مخفف ہے، جس کا مطلب ہے ''ساتھ آؤ''

ہمرچو کے پس منظر کے سلسلے میں ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے ایک روایت بیان کی ہے کہ کسی زمانے میں تھر پارکر میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے سخت قحط پڑا۔ کئی تھری لوگ اپنے گھربار چھوڑ کر نارے کی طرف نکل گئے اور ''اڑیارو'' گاؤں کے پاس تحصیل عمرکوٹ کے علاقے ساریٹی میں جا کر مقیم ہوئے۔ ان میں سوڈی نامی ایک عورت تھی، جس کا شوہر ''چھٹو'' پیچھے رہ گیا تھا۔ جب تک زرعی اجناس کا کام ختم نہ ہوتا وہ واپس جا بھی نہیں سکتی تھی۔ لہٰذا وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھاتی کہ ''آؤ کام کی رفتار تیز کریں'' اور ''ہمراہ اچو'' یا ہمرچو اس سلسلے کا استھائی کا بول بن گیا۔ ہمرچو کے زیادہ تر بول ڈھاٹکی زبان میں اور کچھ سندھی میں بھی ہیں مگر ان کا لہجہ تھری ہے۔

جھولا: یہ ایک مقبول لوک گیت ہے۔ اس کے اثرات سندھ کے معروف شعراء کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔ اسے سندھی میں ''جھولو'' کے نام سے معنون کیا جاتا ہے۔ ''شاہ جو رسالو'' اور ''سچل جو رسالو'' میں بھی جھولا کی صنف پائی جاتی ہے۔ سچل کے کلام میں تو اس کا عنوان بھی ''جھولنو'' ہے۔ داستان، سسی پنوں، میں جھولا کئی اسلوب میں شامل ہے۔ کہیں تو یہ بندروں پر مشتمل ہے، تو کہیں مثمن بند ہے اور کہیں دس گیارہ مصرعوں پر موزوں ہے۔ ''شاہ جو رسالو'' میں سر کاپاتی کے بعد مسدس کے انداز پر بائیس (22) بند ہیں۔ یہ شاہ جو رسالو میں ''مت'' کے نام سے موسوم ہے۔

جھولا کی ہیئت اکثر شعراء نے ''کافی'' کی طرح بھی رکھی ہے۔ موسوی اور عباسی صاحبان نے اپنی مرتب کردہ کتب میں سرہان، نصیر اور موہن کے جھولے درج کیے ہیں جو سرائیکی میں ہیں اور کافی کی ہیئت میں ہیں۔ یہ غالباً نوشہرہ فیروز کے بزرگ شاہ نصیر الدین نقشبندی اور اس کے مرید موہن بھگت کے ہیں۔

سہرے: شادی کے گیت برصغیر کے تمام خطوں کے لوک ورثے کا عظیم سرمایہ ہیں۔ اسے سندھی میں ''گیچ'' بھی کہتے ہیں۔ سندھ میں شادی بیاہ کے گیت اور سہرے شادی کی تقریبات کے ابتدائی مراحل سے لے کر رخصتی تک متعدد رسومات کے لیے مخصوص گیت پائے جاتے ہیں۔ یہ گیت زیادہ تر عورتوں ہی کے لیے موزوں کیے گئے ہیں۔ سندھی میں بھی سہروں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ کچھ سرائیکی مصرعے بھی سندھی سہروں میں شامل ہوتے ہیں۔ ان گیتوں میں متعدد زیورات کا تذکرہ اور ان کی فرمائش بھی ہوتی ہے۔ کئی گیتوں میں سندھ کے معروف زیورات بنانے والے علاقے سے زیور بنا کر لانے کی فرمائش بھی کی جاتی ہے۔

سماع: سماع موسیقی کی ایک صنف ہے جو رقص کے انداز پر صوفی درویشوں کے ہاں مقبول ہے۔ سندھ میں درگاہوں پر سماع کی محفلیں ہوتی رہتی ہیں۔ اسے سندھی میں ''سمھن'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سندھ میں حضرت غوث بہاء الدین زکریاؒ کے سلسلے میں سید علی شیرازی، شاہ عبدالکریم بلڑی اور دیگر صوفیا میں یہ صنف رائج رہی ہے۔ اس میں رقص کے آہنگ کے ساتھ کچھ دُعائیہ بول بھی کہے جاتے ہیں۔

سماع میں گائے جانے والے بولوں کی ہیئت کے اعتبار سے، بہت سے نمونے ہیں۔

نڑ بیت: نڑ، بانسری اور الغوزے کے انداز کا ایک ساز ہے، اس کی لے پر ابیات گائے جاتے ہیں۔ یہ گائیکی کا ایک منفرد انداز ہے۔ ایک شخص مسلسل نڑ بجاتا رہتا ہے اور ایک بیت کہتا ہے، باقی ایک یا دو ساتھی بیت کے آخری مصرع کے ختم ہوتے ہی ''آ۔ہا'' کہہ کر بیت کو ختم کرنے میں ساتھ دیتے ہیں۔

نڑ پر گائے جانے والے بیت ہیئت کے اعتبار سے سندھی بیت ہی ہیں لیکن مصرع نسبتاً لمبا ہوتا ہے اور اکثر مصرعوں کے درمیان میں بھی قافیوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو بیت کی موسیقیت کو برقرار رکھنے میں اور بیت کو مرصع بنانے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سندھی میں نڑ بیت کہنے والے شاعر ویسے تو کئی ہیں، لیکن ساون فقیر، مولا بخش خاص خیلی اور بچایو رند کے نام اہم ہیں۔ ان شعراء نے ان ابیات میں سندھ کے ماحول اور عام زندگی کی عکاسی کی ہے۔ نڑ کے بیت لغت کا بھی ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔ بہت سی ابیات میں تیس، چالیس یا اس سے بھی زیادہ مصرعے ملتے ہیں۔

بنجارہ: ''ونجارو'' سندھی میں کہتے ہیں۔ یہ تھر کا گیت ہے۔ موضوع اور جذبے کے اعتبار سے یہ فراقیہ گیت ہے اور تھر کے علاقے میں مقبول ہے۔ تھری لہجے میں موزوں کردہ یہ لوک گیت راگنی سورٹھ میں گایا جاتا ہے۔

گامن: گامن کا انداز بھی مورو، بیلن اور لولی جیسا ہے۔ روایتی طور پر یہ فراقیہ گیت ہے۔ عام طور پر بالائی سندھ کے علاقے میں مقبول ہے۔ اس گیت سے منسوب ایک روایت کے مطابق گامن نامی ایک شخص لاڑ (زیریں سندھ) چلا گیا۔ اس کی جدائی میں اس کی بیوی نے یہ گیت گایا۔ گامن سار بانوں کا بھی گیت ہے۔ اس کے اکثر بند سرائیکی میں ہیں۔

ڈھولا: یہ گیت سندھ کے بالائی علاقے میں مروج ہے۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی تحقیق کے مطابق یہ گیت مشہور سندھی داستان ''ڈھولا مارو'' سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے۔ ''ڈھولا مارو'' تھر اور راجستھان کے علاقے کی داستان ہے، جس میں ڈھولا مارو کا محبوب ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ پنجاب کا مقبول لوک گیت ''ڈھولا' ض' بھی اسی عشقیہ کہانی سے متاثر ہے۔

مٹھیار: سندھی میں ''مٹھیارد'' محبت کے جذبات کا عکاس یہ لوک گیت تھر پارکر میں بڑے شوق کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ اس کا پس منظر ایک عشقیہ داستان ہے اور روحانی جذبات ہی اس کی بنیاد ہیں۔ اس داستان کا تعلق زیریں سندھ کے شہر جھمکی بازار سے ہے۔ یہ قصہ اُلفت کچھ یوں ہے کہ ایک بیوپاری جو ہار سنگھار اور خواتین کے زیر استعمال آنے والی اشیاء فروخت کرتا تھا، کاروبار کے ہی سلسلے میں اس نے جھمکی بازار میں اپنی دکان کھول لی۔ یہاں پر اس کی ملاقات ایک باکرہ لڑکی سوئل سے ہوئی جو جلد ہی عشق میں بدل گئی۔ ادھر بیوپاری جب اپنا سامان فروخت کر چکا تو وہ دوسرے سوداگروں کے ساتھ اپنے گھر لوٹ آین۔ اس کی محبوبہ نے اس کو روکنے کے لیے بڑی منت سماجت کی، لیکن وہ نہ رکا۔ اس فراق میں منھیار کے لوک گیت معرضِ وجود میں آئے۔

اوڈون: اوڈ ایک قبیلہ ہے، جن کا آبائی پیشہ راج گیری ہے۔ سندھی کی رومانی داستان میں اوڈن اور جام لاکھو پھلانی قصہ بہت مشہور ہے۔ اس داستان کے مطابق لاکھو پھلانی نے اوڈ دوشیزہ سے شادی کر لی اور اس کی خاطر اس نے اوڈو کے عزیز واقارب کے بہت ناز اُٹھائے۔ یہ گیت زیریں سندھ میں رائج ہے۔ موضوع کے لحاظ سے یہ انسانی عجز وانکساری کو ظاہر کرتا ہے کہ غریب لوگ نوابوں کے محل دیکھ کر بھی اپنی حیثیت کو نہیں بھولتے۔

مدھانی: اس سندھی لوک گیت کا تعلق مندھی یا ''مندھیڑو'' سے ہے جو دودھ بلونے کے کام آتی ہے۔ اس کی نسبت سے یہ لوک گیت خوش حالی کی تمنا کو ظاہر کرتا ہے۔ اس گیت کا تعلق بھی تھر سے ہے۔ گیت کے استھائی کے بولوں میں مدھانی کی مخصوص آواز ''گڑ کے'' سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ عام طور پر دودھ بلوتے وقت یہ گیت گایا جاتا ہے۔

کانگڑو: کانگ (کوا) کی تصغیر کانگڑو۔ کوے کو مختلف زبانوں کے اشعار میں پیغامبر کے طور پر لایا گیا ہے۔ ہندی اور سندھی زبانوں میں تو خاص طور پر کوا ایک قاصد ہے۔ یہ لوک گیت تھر اور سندھ میں گایا جاتا ہے۔ اس میں محبت اور مجاز کے علاوہ بھی دیگر گونا گوں مضامین قلمبند ہوتے ہیں۔ کہیں ایک شادی شدہ عورت کے جذبات ہیں جو میکے کی یاد کو ظاہر کرتا ہیں۔ اس حوالے سے یہ گیت اکثر عورتیں شادی بیاہ کی محفلوں میں بھی گاتی ہیں۔

موڈی: یہ بالائی سندھ کا گیت ہے۔ اس کے تخلیقی پس منظر کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔ یہ سرائیکی زبان میں دو دو مصرعوں پر مشتمل ہے۔

وائی: وائی کو مقبولیت بنیادی طور پر حضرت شاہ عبداللطیف کے رسالے سے ملی ہے کیونکہ اس رسالے میں ہر داستان کے آخر میں ایک یا ایک سے زائد وائیاں ملتی ہیں۔ وائی کی ہیئت وزن پر ہے۔ سندھی بیت میں آخری مصرع میں قافیہ درمیان میں آتا ہے اور وائی میں مصرع کے آخر میں۔ وائی سے ''کافی'' معرضِ وجود میں آئی اور دونوں میں ہیئت کا فرق بن گیا ہے۔ وائی کا ''شاہ جو رسالو'' کے لحاظ سے ایک مخصوص گائیکی کا انداز ہے جو در ید کے طرز پر گائی جاتی ہے۔

CamScanner

بقیہ انٹرویو: محمد حسن معراج

س: اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

ج: پہلی کتاب ریل کی سیٹی، تقسیم کے پس منظر میں ریلوے سٹیشن سے جڑی شہروں اور قصبوں کی کہانیاں۔

س: اصناف سخن میں سے دل کے زیادہ قریب کون سی صنف ہے؟

ج: ناول

س: کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہے؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے؟

ج: جی نہیں، شاید میں خود کو اتنا آدرشی نہیں سمجھتا کہ کسی ادبی تحریک کا حصہ بن سکوں اور اس کے نصب العین کی طرف کوئی خاطر خواہ پیش قدمی کر سکوں۔ سیاست ایک بہت متنوع چیز ہے۔ اس بارے میں دو آراء ہیں، ایک تو یہ کہ لکھنے والے کو غیر سیاسی ہونا چاہیئے۔ وگرنہ اس کی تحریر ایک خاص طرح رنگ لے کر آتی ہے اور ایک موقف کی تائید کرتی ہے جبکہ دوسرے کی تنقیص۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اہل قلم یا فکری یا شعوری صلاحیت کے حامل افراد کو بہر حال سیاسی نظریے سے لاتعلقی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔

س: کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

ج: جی اس کا سیدھا جواب میرے لئے دینا مشکل ہے۔ ایک بات بہر حال طے ہے کہ موبائل کی وجہ سے فارغ اوقات میں کتاب پڑھنے کا رجحان ختم ہو رہا ہے۔ مثلاً کسی نے اگر کسی کلینک پہ جانا ہو، سفر پہ نکلنا ہو، انتظار گاہ میں وقت گزارنا ہو تو پہلے وقتوں میں وہ کتاب پڑھ لیتے تھے، اب وہ سارا وقت موبائل پہ گزرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ادبی میلے، تخلیق سے جڑے دوسرے شغف ایسے ہیں کہ لکھنے والوں کو پذیرائی پہلے سے زیادہ مل رہی ہے۔ تخلیق کی عمومی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن یہ میری رائے ہے اور میں غلط بھی ہو سکتا ہوں۔

س: کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج: جی ''داستان'' ہمارا گھر ہے۔ چھوٹا سا جنگل ہے، وہاں گزرنے والا ہر لمحہ آسودگی سے سرشار ہے۔ تخلیقی طور پر بھی اور زندگی کے اعتبار سے۔ جہاں تک آپ کے سوال کا زمانی پہلو ہے تو شاید وہ وقت جب میں صرف اپنے لئے لکھتا تھا۔

س: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج: میرے نزدیک تخلیق کا سفر انفرادی سرشاری سے شروع ہو کر اجتماعی نمو تک کا دورانیہ ہے۔ اب ایک ایسی چیز وجود میں لاتے ہیں جو آپ کو خود بھی طمانیت سے بہرہ ور کرے اور اس کے بعد جہاں تک پہنچے وہاں بھی لوگ اس سے فیض یاب ہوں۔

س: برطانیہ میں قیام کے دوران آپ نے اردو زبان کے فروغ کے لئے کام کیا؟ کیا آپ کو اپنی اس محنت کے کوئی اثرات محسوس ہوتے ہیں؟

ج: جی میں نے باقاعدہ طور پر کوئی کام نہیں کیا۔

س: عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج: 1999 میں پاکستان کی مسلح افواج میں شمولیت اختیار کی۔ 2016 میں ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس کے بعد لکھنے پڑھنے سے وابستہ رہا۔

س: کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے یا اندرون سے؟

ج: جی داخلی طور پر ایک اور طرح سے تحریک ملتی ہے اور خارجی طور پر ایک اور طرح سے بڑھاوا ملتا ہے۔ خارجی طور پر جو آپ کے سامنے ہو رہا ہو، اچھا یا برا وہ آپ کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ داخلی طور پر ایسے کہ آپ ایک حد تک اس عمل سے گزرتے ہیں کہ میں لکھوں یا نہ لکھوں؟ پھر آپ کو ادراک ہوتا ہے کہ اگر نہ لکھا تو آپ کڑھتے رہیں گے سو آپ لکھتے ہیں۔

س: آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج: سوشل میڈیا کا بہت توانا کردار ہے۔ ابلاغ کا ایک اپنا ذریعہ ہے جس نے وقت اور ادارہ جاتی بندشوں سے لکھنے والے کو آزاد کر دیا ہے۔ دیکھتے نا پہلے شاعر نظمیں، غزلیں لکھتے تھے، پھر وہ رسالوں میں چھپتی تھیں، پھر چھاپہ خانہ پہنچتی تھیں۔ پھر شہرت کا معاملہ شروع ہوتا تھا۔ اب یہاں یہ رہا نہیں۔ اب سویرے نظم کہیں اور شام کو اس کے ٹک ٹاک مارکیٹ میں آ چکے ہوتے ہیں۔

س: ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج: بہت زیادہ، میں سمجھتا ہوں کہ آدمی بہت سے واقعات، حالات اور عناصر سے مل کر تخلیق پاتا ہے۔ یہ جذبات اس کے کل کو مکمل کرتی ہیں۔

س: کیا کھویا کیا پایا؟

ج: بہت بڑا سوال ہے، بہت کچھ کھویا ہے لیکن کافی کچھ پایا بھی ہے۔ جو پایا ہے اس کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہوں لیکن بہر حال ایک شکر گزاری کا احساس ہے۔ جو کھویا ہے اس کا تاسف دل سے اُتارنے کی کوشش جاری ہے۔

س: آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟ مستقبل کے کیا ارادے اور منصوبے ہیں؟

ج: ایک کتاب ہے اور کچھ تھیٹر سے متعلق کام ہے۔ جنگ عظیم اول میں ہندوستانی سپاہیوں کے متعلق کتاب ہے، جبکہ تھیٹر موجودہ صورتحال کے بارے میں ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی یادیں

عامر بن علی/ جاپان

پندرہ برس پہلے یہ جولائی ہی کا مہینہ تھا۔جب عہد ساز ادیب،شاعر اور صحافی احمد ندیم قاسمی ہم سے جدا ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ان کی موت سے پیدا ہونے والا خلا اس لئے بھی کبھی پُر نہیں ہو سکتا کیونکہ احمد ندیم قاسمی فقط ایک فرد کا نام نہیں بلکہ اردو شعروادب اور صحافت کے ایک عہد کا نام ہے۔وہ قلم قبیلے کا ایسا روشن حوالہ ہیں جس کی چکا چوند ان کی موت بھی کم کرنے میں ناکام رہی ہے۔اہل قلم کا ایک قافلہ انہوں نے اپنی زندگی میں تیار کیا جس کے نا صرف وہ میر کارواں تھے بلکہ استاد اور سالار بھی تھے۔ان کی شاگردی میرے لئے تو ہمیشہ باعثِ اعزاز اور ''قاسمی سکول آف تھاٹ'' سے تعلق افتخار کی بات رہی ہے۔ایسی شاندار،بامقصد،بامعنی زندگی گزارنے والے شخص کی حیات جاوداں چراغوں کے ایک سلسلے کی طرح ہماری جہالت کے اندھیرے مٹاتی اور رہنمائی کرتی چلی جاتی ہے۔قاسمی صاحب کے چہرے پر ہمیشہ تبسم رہتا تھا۔ان کے لہجے کی نرمی سے ان کی سخت اصول پسندی اور نظریاتی وابستگی کی گہرائی کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

اگر کہا جائے کہ برصغیر پاک و ہند میں روزنامہ امروز پہلا اردو اخبار تھا جسے عوامی مقبولیت اور قبولیت حاصل ہوئی تو یہ مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حق بیانی ہوگی۔احمد ندیم قاسمی نہ صرف اس کے ایڈیٹر رہے بلکہ اردو صحافت کی تاریخ میں جو معتبر مقام روزنامہ امروز کو حاصل ہے اس میں کلیدی کردار قاسمی صاحب کا ہی تھا۔صحافیوں کی ایک پوری نسل کی انہوں نے تربیت کی اور تادم مرگ جنگ اخبار میں باقاعدگی سے کالم لکھتے رہے۔امروز ان کی ادارت کے دنوں میں ترقی پسند اور بائیں بازو کے نظریات کا حمایتی اخبار تصور کیا جاتا تھا۔جنرل ایوب خان نے جب مارشل لاء نافذ کیا تو اس کے کچھ ہی عرصے بعد قاسمی صاحب پابند سلاسل کر دیئے گئے۔ان کا اخبار قومیا لیا گیا۔ایک شام ٹمپل روڈ لاہور میں ان کے اشاعتی ادارے ''اساطیر'' کے دفتر میں بیٹھے تھے کہ انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی گرفتاری کی روداد بیان کی تھی۔بتاتے تھے کہ لباس اور جوتے تبدیل کرنے کی اجازت بھی سرکاری حکام نے بمشکل عطا فرمائی تھی۔آزادی صحافت اور جمہوریت کی بالا دستی کے لئے بار ہا انہیں جیل جانا پڑا۔نظریاتی آدمی تھے لہٰذا ماتھے پر کبھی شکن نہیں لے کر آئے۔حریت فکر کا راستہ انہوں نے خود ہی اپنے لئے منتخب کیا تھا۔مجبوری نہ تھی۔

محبت کرنے والے آدمی تھے یوں کہہ لیجئے کہ سراپا محبت تھے۔ہمارے ایک ہم عصر شاعر ان کے دفتر میں بیٹھے ایک دن قاسمی صاحب کو اپنی بدگوئی اور جھوٹے پروپیگنڈے کی صفائی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ محبت کا یقین بھی دلانا چاہتے تھے۔مذکورہ شاعر چونکہ ایک ادبی چیتھڑے کے ایڈیٹر بھی تھے جس میں قاسمی صاحب کے بارے میں بدزبانی اور بے سروپا الزام تراشی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔میں نے جب یہ منظر دیکھا تو اس بات پر حیران تھا کہ قاسمی صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ مصنوعی نہ تھی بلکہ محبت سے لبریز تھی۔معاصر شاعر کو کہنے لگے کہ ''محبت ایسا جذبہ ہے کہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی ،اس کا پتہ چل جاتا ہے،خود بخود'' بتاتے تھے کہ اپنے ادبی سفر کا آغاز انہوں نے شاعری سے کیا تھا۔بعد ازاں افسانہ نگاری اور کالم نویسی کی جانب راغب ہوئے۔اقبال،ظفر علی خاں اور اختر شیرانی کی شاعری انہیں زیادہ پسند تھی۔جبکہ افسانے کے معاملے میں وہ منشی پریم چند کے عاشق تھے۔فیض احمد فیض کے ساتھ ان کا انگریزی کی ترکیب کے مطابق ''لو ہیٹ''یعنی محبت اور نفرت کا ملغوبہ نما تعلق تھا۔یہ تعلق تھا مگر بہت گہرا۔دونوں ہم عصر بائیں بازو کے شاعر ،ایک ہی اخباری گروپ کے ایڈیٹر،یاد رہے کہ فیض صاحب انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کے انہی دنوں ایڈیٹر تھے جن دنوں قاسمی صاحب امروز کے مدیر تھے۔ترقی پسند تحریک سے وابستہ ان دونوں نابغہ روزگار شخصیات کی باہمی خط و کتابت بھی رہی جو کہ اب کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے اور خاصے کی چیز ہے۔گرچہ دونوں کے درمیان معاصرانہ چشمک بھی پائی جاتی تھی۔

ایک دن میں نے قاسمی صاحب سے فیض احمد فیض کا ذکر چھیڑ دیا۔ان کے چند شعر سنائے،چونکہ آدھا ''نسخہ ہائے وفا'' تو مجھے زبانی یاد تب بھی تھا،اپنے اور فیض صاحب کے باہمی تضادات کا ذکر کرنے لگے۔چین کے دورے کا تذکرہ چھیڑ دیا،کہنے لگے کہ فیض اور میں ایک جھیل کی سیر کے موقع پر ایک کشتی میں سوار تھے۔فیض صاحب رسیا آدمی تھے۔دیگر موجود احباب بھی ان کے ساتھ مے نوشی میں مشغول تھے۔ان کے دل میں نا جانے کیا آئی کہ ایک جام شراب کا بھر کر مجھے بڑی لجاجت سے پیش کرنے لگے۔میں نے انکار کیا۔اصرار بڑھتا گیا تو میں نے جام تھام لیا۔کچھ توقف کے بعد میں نے اس جام کو جھیل کے پانی میں انڈیل دیا۔یہ دیکھ کر فیض

صاحب کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا۔ کہنے لگے تم نے شراب کی توہین کی ہے، اب میں کبھی تمہیں شراب پیش نہیں کروں گا۔ قاسمی صاحب صاف ستھرے آدمی تھے۔ زندگی میں کبھی شراب نوشی نہیں کی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں ترقی پسند تھا اور ہوں مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک سیدھا سادہ مسلمان بھی ہوں۔ میں نے انہیں کبھی میلے لباس میں نہیں دیکھا، روزانہ شیو بناتے تھے، نوے سال کی طویل عمر پائی مگر عمر کے آخری برسوں میں بھی ذہنی اور جسمانی طور پر ہمیشہ انہیں مستعد پایا۔ منیر نیازی انہیں ''سدابہار بوڑھا'' کہتے تھے۔ منیر نیازی صاحب کی باتوں کا کیا برا ماننا، ''بڑے آدمی تھے'' خیر یہ تو بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں کہ مجھے انٹرویو دیتے ہوئے قاسمی صاحب نے بھی منیر نیازی کے بارے میں کہا تھا کہ وہ صرف سطح کی شاعری کرتے ہیں، انہیں تو گہرائی میں جانے سے با قاعدہ خوف آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے آپ کو نقاد بھی بہت ملیں گے۔ جس کی وجہ میری نظر میں تو واحد یہ ہے کہ ان کی سماج میں عزت اور اثرورسوخ چونکہ بہت زیادہ تھا، اس لئے بہت سارے لوگ ان کو ہدفِ تنقید بنا کر لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذاتی طور پر ان کا ماننا تھا کہ میری مخالفت کا آغاز اس وقت ہوا جب رسالہ ''فنون'' جاری ہوا۔ یاد رہے کہ قاسمی صاحب نے نصف صدی سے زائد عرصے تک اردو زبان و ادب کے اس سب سے معتبر و موقر رسالے کی ادارت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ آج کل ان کی دختر نیک اختر ان کا یہ ادبی مشن جاری رکھے ہوئے ہے۔

احمد ندیم قاسمی جیسا نفیس اور شائستہ آدمی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ غیرت مند اور ہمدرد شفیق مگر اصول پرست، روشن خیال مگر بلند کردار۔ اپنی زندگی کی آخری دو دہائیاں ہم نے انہیں لاہور کے مال روڈ پر مجلس ترقی ادب کے دفتر میں صدر نشین کی کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ ضعیفی کے باوجود ایک عجیب وقار، رعب اور طنطنہ تھا ان کی شخصیت کے اندر کرسی پر ڈھیلے، ڈھالے نہیں بیٹھتے تھے۔ بلکہ الرٹ اور تیر کی طرح سیدھی کمر کے ساتھ۔ انتہائی غریب پرور انسان تھے۔ دوسروں کے کام آنے والے۔ ایک محنت کش اور غیرت مند ماں کی اولاد تھے جو کہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی، انا اور غیرت کے ساتھ مفلسی کے مشکل دن بچوں کے ساتھ کاٹنے والی اس عورت کی ساری خوبیاں ان کے بیٹے میں بھی نظر آتی تھیں، دنیا جسے آج احمد ندیم قاسمی کے نام سے جانتی ہے۔ پاکستان کے تمام اہم سرکاری اعزازات اور تمغے انہیں ملے لیکن میں نے قصداً ان کا ذکر نہیں کیا۔ چونکہ اقربا پروری اور سیاسی وابستگیوں کی بنیاد پر اعزازات کی لوٹ سیل نے ان کی قدر و قیمت کو ڈالر کے مقابلے میں پاکستانی روپے کی قیمت سے بھی کم کر دیا ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کے لئے سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ عام لوگ اسے کیسے یاد رکھتے ہیں؟ اس بے بدل شاعر اور اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار کا اصل اعزاز یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے۔ اہلِ محبت دعاؤں میں اسے یاد کرتے ہیں۔ انہی کے ایک شعر کے ساتھ خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

❀❀❀

عامر بن علی/ جاپان

دشتِ تنہائی

جانے وہ کس دیس میں ہوگا
کیسا ہوگا۔۔۔؟
آخر شب یہ اکثر سوچا کرتا ہوں میں
کل کی بات نہیں ہے برسوں بیت گئے ہیں
گو کہ ویسا رشتہ بھی اب نہیں رہا ہے
لیکن یہ بھی سچ ہے جب سے وہ بچھڑا ہے
اس کی یاد سے خالی کب کوئی دن گزرا ہے
مان لیا تقدیر میں جو کچھ بھی لکھا تھا
پھر بھی اک احساس کا رشتہ سا باقی ہے
تنہائی کا اب بھی کوئی تو ساتھی ہے

❀❀❀

سدھانت

نفرتیں، پیار دوست اور دشمن
چند جذبے ہیں اور کچھ رشتے
اپنے جیون کو جو بناتے ہیں
کامیابی کے قیمتی نسخے
جیسے ناصح ہمیں بتاتے ہیں
کوئی بھی جذبہ کوئی بھی رشتہ
دل میں پائے جگہ نہ بھولے سے
اپنے دل میں جگہ نہ پائیں گے
ایسے منشور کامرانی کے
جگ سے ناکام لوٹ جائیں گے

❀❀❀

کولسری صاحب

حسن عباسی/لاہور

اسلم کولسری صاحب سے میری گنتی کی چند ملاقاتوں سے ایک دو زیادہ ملاقاتیں ہوں گی۔ دوستی کا دعویٰ تو کبھی نہیں رہا البتہ اجنبیت بھی نہیں تھی۔ ایک محبت بھری شناسائی رہی جو ان کی وفات کے بعد بھی زندہ ہے۔

جہاں تک میں انہیں جان سکا ہوں وہ نیند سے عشق کرتے تھے۔ سگریٹ اُن کی پہلی محبت تھی اور چائے کے ساتھ انہوں نے دوستی زندگی بھر نبھائی۔

میری اُن سے پہلی ملاقات اردو سائنس بورڈ کے دفتر میں ہوئی۔ وہ مجھ سے اُسی عاجزی اور انکساری کے ساتھ پیش آئے جس عاجزی اور انکساری کے ساتھ وہ ڈی جی اردو سائنس بورڈ کے سامنے پیش ہوئے۔

وہ حد سے زیادہ شریف آدمی بلکہ بے حد سے زیادہ شریف آدمی تھے۔ ۲۰۰۷ء میں جب پہلی بار مجھے فروغِ اردو ادب دوحہ قطر کے عالمی مشاعرہ کا دعوت نامہ ملا تو ان دنوں کولسری صاحب سے چند ملاقاتیں مختصر وقفوں میں ہوئیں کیونکہ وہ اس تنظیم کے پاکستان میں کوآرڈی نیٹر تھے۔ ان ملاقاتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ ''نیند نیند اور خواب خواب'' سے آدمی ہیں۔

قیلولہ کی ادائیگی وہ فرض نماز کی طرح کرتے تھے۔ جیسے کوئی نمازی اذان کے وقت دوستوں کی محفل یا دفتری اوقات کی پروا کیے بغیر نماز پڑھنے چلا جاتا ہے اسی طرح وہ قیلولہ کے لیے غائب ہو جاتے۔

اُن سے بوقتِ ملاقات سگریٹ سلگانے اور دھوئیں کے مرغولے فضا میں بلند کرنے کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہتا۔ وہ سگریٹ کی دھیمی دھیمی آنچ میں سلگتے رہتے اور دوستوں کو اپنی باتوں کی آنچ میں سلگاتے اور کبھی کبھار شعر کے شعلے سے جلا کر خاکستر کر دیتے تھے۔

کولسری صاحب کی یہ خوبی تھی کہ دوستوں کی آمد پر چائے کا خاص اہتمام کرتے اور چائے پلانے کے بعد یوں مطمئن ہو جاتے جیسے انہوں نے دوستی کا حق ادا کر دیا ہو۔

دوحہ کے شیزان ہوٹل میں ہمارے کمرے ایک ساتھ تھے۔ گمان یہی تھا یہاں ایک ہفتے کے قیام کے دوران اُن سے خوب ملاقاتیں رہیں گی مگر معاملہ اس کے برعکس رہا۔ اگر میں کہوں کہ ہفتہ میں انہوں نے دو ہفتے سو کر گزارے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ اس میں آپ راتیں بھی شامل کر لیں۔ ہاں اس کے برعکس میں نے تنظیم کے صدر اور منتظم مشاعرہ ملک مصیب الرحمٰن کو کبھی سوتے نہیں دیکھا۔

۹۰ء کی دہائی میں شعراء کے تعارف کے ساتھ ''دھیمے لہجے کا شاعر'' لکھنے کا رواج عام تھا مگر کولسری صاحب حقیقت میں دھیمے لہجے کے شاعر تھے۔ انہوں نے مجلس کی طرف سے منعقدہ ایوارڈ کی تقریب کی نظامت بھی اسی دھیمے لہجے میں خوب کی۔ نظامت کے دوران وہ ایک ایک لفظ کو اس طرح واضح طور پر ادا کرتے کہ جملہ سامعین کو زبانی یاد ہو جاتا۔ مشاعروں میں بھی غزل اسی طرح ٹھہر ٹھہر کے پڑھتے تھے۔ میں نے کئی مشاعرے ان کے ساتھ پڑھے۔ وہ مشاعرے میں بغیر تیاری کے آتے تھے۔ پھیکے رنگ کی سادہ سی شلوار قمیص پہنے ہوئے، کپڑوں پہ عموماً استری نہ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ کلام بھی غیر منتخب ہوتا تھا جو غزل مشاعرے کی نہ ہوتی عموماً وہی پڑھتے تھے۔ ان کی طبیعت داد اور بے داد سے بے نیاز تھی۔ پذیرائی کی وہ اتنی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے اس کے باوجود اُن کی شخصیت جاذبِ نظر تھی۔ لوگ ان کی عزت کرتے تھے اور مشاعروں میں وہ اس سب کے باوجود داد سمیٹنے میں کامیاب ہو جاتے۔ اسٹیج تک جانے، غزل سنانے اور واپس اپنی نشست پر آ کر بیٹھنے میں ان کے ہاں مکمل تہذیب تھی۔ وہ اگلے وقتوں کے آدمی تھے جو کہ شاید غلطی سے اس صدی میں پیدا ہو گئے تھے۔ اس سے ان کی ہنسی میں ایک کرب شامل ہو گیا تھا جو اس بات کا غماز تھا۔ غم کا موقع ہو یا خوشی کا یا معمول کے حالات اُن کی آنکھوں کے کنارے ہمیشہ بھیگے رہتے یوں لگتا جیسے ابھی کوئی آنسو پلکوں سے ڈھلک کے گال بھگو دے گا مگر وہ آنسو زندگی بھر نہیں ڈھلکا۔ اُس دن بھی نہیں جس دن اُن کے ہمدمِ دیرینہ ملک مصیب الرحمٰن ان کو چھوڑ کر چلے گئے۔ میں جنازے اور قل خوانی میں شریک تھا۔ ان کی نم دیدہ آنکھیں دیکھتا رہا مگر وہ آنسو نہ ڈھلکا البتہ اُٹھتے بیٹھتے اُن کی تکلیف سے لگتا تھا جیسے مصیب الرحمٰن کی وفات سے ان کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ کولسری صاحب منیر نیازی کے اس شعر کی عملی تصویر تھے:

جانتا ہوں ایک ایسے شخص کو میں بھی منیرؔ
غم سے پتھر ہو گیا لیکن کبھی رویا نہیں

کولسری صاحب نہایت باہمت اور پرعزم انسان تھے۔ وہ ایسے شجر کی طرح تھے جو بظاہر سرسبز تھا اُس کے اندر بہت سے پرندوں نے گھونسلے بنا لیے تھے۔ وہ ان پرندوں کا مسکن تھا مگر کوئی ان دیکھا کرب اور نہ سمجھ میں آنے والا دکھ دیمک کی طرح اندر ہی اندر اُس کو چاٹ رہا تھا۔ اُس کے اس شعر میں اس دکھ

اور کرب کو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مجھے اپنا گماں ہوتا ہے اسلم
چمن کے درمیاں سوکھے شجر پر

کولسری صاحب کا دکھ مجید امجد سے اس لیے گہرا تھا کہ ان کی زندگی میں کوئی "شالاط" نہیں تھی۔ اگر کوئی تھی تو مجھے اس کا علم نہیں۔ میں نہیں جانتا انہوں نے زندگی میں کوئی محبت کی یا نہیں، کسی حسینہ کو دل دیا یا نہیں، کسی سے راز و نیاز کی باتیں کیں یا نہیں مگر وہ اپنے لباس، حلیے اور چہرے کی ویرانی سے کسی محبت میں "برباد برباد" سے لگتے تھے اور اس بربادی کو وہ سگریٹ کے دھوئیں اور مصنوعی ہنسی میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے رہتے تھے۔

دوحہ کے عالمی مشاعرے میں یوں تو انڈو پاک کے بیشتر سینئر اور نوجوان شعراء آئے ہوئے تھے مگر یہ سب شعراء ٹولیوں کی شکل میں ادبی نشستیں برپا کرتے اور ہوٹل سے باہر قدم رکھنا گناہِ کبیرہ سمجھتے تھے۔ مجھے سیاحت کا شوق تھا اور میں اس صورت حال سے پریشان تھا۔ آخر میں نے ایک دن کولسری صاحب کو بہلا پھسلا کر بیچ (Beech) پر جانے اور دوحہ کی سیر کرنے پر راضی کر لیا۔ وہ اپنی طبیعت پہ جبر کر کے میرے ساتھ چل پڑے۔ مصیب صاحب نے گاڑی کا انتظام کر دیا۔ دوحہ میں گرمی بہت شدید پڑتی ہے۔ بیچ پر شام کے وقت بھی دوپہر تھی اور دوپہر اور قیلولہ کولسری صاحب کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ میں نے یہاں بہت سی تصاویر اُن کے ساتھ بنوائیں۔ ہر تصویر میں وہ "مسٹر مجبور" بن کر میرے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اب کبھی ان تصاویر کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان کی معصومیت پر بہت پیار آتا ہے۔ کیسے بھلے لوگ ہیں ہمارے سینئر شعراء بھی۔

کولسری صاحب بہت سی خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ باکمال شاعر، دل پذیر ناظم، منفرد اداکار، بہترین صداکار، اچھے صحافی، دل نشیں D.J اور پُر درد شوقیہ گلوکار۔

شاعری ان کی زندگی تھی۔ سانس لینے کا بہانہ تھی۔ نظامت میں وہ اپنا آپ بیان کرتے۔ مہمانوں کی شخصیت کی گرہیں کھول کے حاضرین کے لیے اس کو آسان بنا دیتے۔ نظامت کرتے ہوئے انہیں حاضرین محفل کے جذبات سے کھیلنے کا ہنر بھی خوب آتا تھا۔ لوگوں کے دل اور آنکھیں ان کے جملوں کی تاثیر میں کھوئی ہوتی تھیں۔ کبھی بھیگتیں، کبھی مسکراتیں، چمک دمک اور رم جھم کا یہ سلسلہ محفل کے اختتام تک جاری رہتا تھا۔

ادبی دنیا میں بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ وہ ایک ذہین اور باکمال اداکار تھے۔ متعدد ڈراموں میں انہوں نے اداکاری کے جوہر دکھائے جو کردار ملا اُسے اس جاں فشانی سے نبھایا کہ اُن پر اُسی کردار کا گمان ہونے لگا۔

ٹی وی کے ایک ڈرامے میں مشاعرے کے سین کی ریکارڈنگ تھی اس میں بطور شاعر کولسری صاحب نے مجھے بھی ریکارڈنگ کے لیے بلایا ہوا تھا۔ چند دیگر دوست بھی تھے۔ یہاں سہیل احمد خاں سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اُس دن مجھے اپنی آنکھوں سے کولسری صاحب کی اداکاری دیکھنے کا موقع ملا۔ اگر وہ اس شعبہ کو سنجیدگی سے اختیار کرتے تو بلاشبہ ان کا شار قوی خاں اور علی اعجاز جیسے اداکاروں کی فہرست میں ہوتا۔

کولسری صاحب نے ریڈیو پر بھی بہت سے پروگرامز کیے جن میں ڈرامہ، صداکاری، مزاحیہ پروگرام و کمپیئرنگ اور ادبی پروگرام شامل ہیں۔ ایف ایم پر ان کا پروگرام بہت مقبول ہوا۔ خاص کر وہ کردار جس میں وہ عام لوگوں، کم پڑھے لکھے افراد اور دیہاتی لوگوں سے مخاطب ہوتے، ان کے لب و لہجے اور انداز میں بات کرتے، لطیفے سناتے، چٹکلے چھوڑتے تھے مگر اُس میں نصیحت اور سبق آموز باتیں ہوتیں جن میں زندگی کا درس شامل ہوتا۔ ایف ایم ریڈیو پہ ان کا پروگرام اُس وقت مقبول ہوا جب ریڈیو اپنی مقبولیت کھو چکا تھا۔ کیونکہ لوگوں کے پاس اب دلچسپی کے بہت سے دیگر ذرائع تھے۔

صداکاری میں اُن کی آواز درد اور درد آواز بن جاتا تھا۔ کولسری صاحب کا ترنم نہایت پرسوز تھا۔ درد کی وہی لہر جو اُن کے اندر تلخیٔ حالات کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی اُس کی کسک اُن کے ترنم میں بھی واضح طور پر سنائی اور دکھائی دیتی تھی۔ ترنم میں اپنی غزل سناتے ہوئے وہ خود اس درد کی لہر کے ساتھ بہہ جاتے تھے اور سامعین کنارے پر کھڑے انہیں ڈوبتا دیکھتے رہتے۔ جس طرح زندگی میں ہم سب کنارے پر کھڑے ان کے ڈوبنے کا تماشا دیکھتے رہے۔

کولسری صاحب کے اتنے روپ تھے کہ ان پر کبھی کبھی بہروپیے کا گمان گزرتا تھا۔ اس بات کا احساس ان کو خود بھی تھا۔ بقول ان کے:

آخر کس بہروپ کو اپنا روپ کہوں
اسلم روپ بدلتے جیون بیت گیا

کولسری صاحب ان بہت سی خوبیوں کے باوجود محفل کے آدمی نہیں تھے۔ ہجوم سے دور بھاگتے تھے۔ زیادہ لوگوں کی موجودگی میں ان کا دم گھٹتا تھا۔ البتہ چند دوستوں کی موجودگی میں مختصر گفتگو، خاموشی کے مناسب وقفوں، ایک دو سلجھے ہوئے لطیفوں اور ہلکے پھلکے مذاق سے گزارا کرتے تھے۔ بہت زیادہ دوستوں کی موجودگی میں وہ تنہا ہو جاتے تھے۔

کوئی سویا ہوا صدمہ ہی جاگے
ہجومِ دوستاں ہے تخلیہ ہے

CamScanner

چائے کی پیشکش کھلے دل سے کرتے اور میز کی دراز میں بسکٹ بھی ہمیشہ موجود ہوتے تھے۔ اس معاملے میں نہایت سلیقہ شعار تھے۔

شاعری کی مرمت و درستگی کی ورکشاپ بھی خفیہ طور پر قائم کر رکھی تھی۔ اُستاد آدمی تھے۔ عروض اور فنی رموز جانتے تھے اس لیے کئی شعراء و شاعرات کا کلام اُن کے پاس برائے اصلاح و درستگی موجود ہوتا۔ مزاجاً سست اور کاہل تھے۔ اس لیے کئی کئی برس تک کچھ شعراء کے مسودے پڑے رہتے تھے۔ اس مزدوری کا وہ کوئی محنتانہ وصول کرتے تھے یا نہیں، میں اس بارے میں نہیں جانتا۔ میں نے جب اپنے پبلشنگ کے ادارے "نستعلیق مطبوعات" سے کتابیں شائع کرنا شروع کیں تو ان کتب کا معیار ان کو بہت پسند آیا اور اپنے شاگردوں کی کچھ کتابیں انہوں نے میرے ادارے سے شائع کروائیں۔ انہیں کتاب سے بے حد لگاؤ تھا اور کتاب کی اشاعت سے متعلق بھی وہ اپنا نکتۂ نظر رکھتے تھے۔ مثلاً ایک بار انہوں نے مجھے بتایا کہ ہمارے ہاں چونکہ گرمیاں زیادہ عرصہ کے لیے ہوتی ہیں اس لیے اگر کتابوں کے سرورق میں جو رنگ استعمال کیے جاتے ہیں وہ ہلکے اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والے ہوں تو کتابیں زیادہ جاذب نظر بن جائیں۔

کتاب سے محبت انہیں اردو سائنس بورڈ کے ادارے میں لائی اور پھر وہ اسی ادارے سے ریٹائر ہوئے، ورنہ جو سستی اور کاہلی اُن کے مزاج کا حصہ تھی شاید کسی اور ادارے میں وہ کھپ نہیں پاتے۔ ان کا حال بقول غالب کچھ یوں تھا:

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

بطور صحافی بھی انہوں نے خدمات سرانجام دیں۔ لاہور میں روزنامہ "مشرق" جیسے معتبر اخبار کے سب ایڈیٹر رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی "دنیا" اخبار میں ملازمت کرتے رہے۔ یہ سب کام اگرچہ ان کے مزاج کا حصہ نہیں تھے مگر زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے انہیں طوعاً و کرہاً کرنا پڑتے تھے۔ شاعری کے علاوہ ان کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ یہی حقیقت ہے باقی سب فسانہ۔

عطاء الحق قاسمی صاحب کے رسالے "معاصر" کی مکمل تدوین ان کے ذمہ تھی۔ کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، پیسٹنگ وغیرہ اشاعت کے لیے کاپیاں مجھے ان سے ہی ملا کرتی تھیں اور یہ غیر معمولی کام ہوا کرتا جسے وہ عرق ریزی سے سرانجام دیتے تھے۔ اسی طرح ایک دو بار میں نے انہیں امجد اسلام امجد صاحب کی کتب کی کمپوزنگ اور تدوین سے متعلق سرگرداں پایا اور بھی شاید کچھ ادیبوں کے کام کرتے ہوں۔ پنجابی کے ادارے پلاک اور ایف ایم ۹۵ میں بھی انہوں نے خدمات سرانجام دیں مگر وہ زندگی میں کوئی خاطر خواہ مفاد نہ اٹھا سکے۔ شاید انہیں اس کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ اس حوالے سے وہ ناکام شخص تھے۔ اس [illegible] وہ خود کو ٹھہراتے ہیں تو درست ٹھہراتے

اسی محنت سے کھویا ہے جو کھو سکتا تھا میں
[illegible] ہوا ہوں جس قدر ویران ہو سکتا تھا میں

اگر ہم کولسری صاحب کی زندگی پر نظر ڈالیں تو وہ ان کے مزاج کے برخلاف سخت جدوجہد سے عبارت ہے۔ والدین متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ میٹرک کے بعد وسائل اتنے نہ تھے کہ کالج میں داخلہ لیتے۔ لہٰذا عام مزدور کی حیثیت سے ستلج کاٹن ملز اوکاڑہ میں نوکری کی۔ کچھ عرصہ بعد جامعہ مدینہ پرائمری سکول کوٹ لیاقت حیات اوکاڑہ میں بطور ٹرینڈ مدرس ملازمت کی۔ عرفان فارمیسی اوکاڑہ میں لیبارٹری اسسٹنٹ اور سپروائزر رہے۔ ثاقب انڈسٹریز اوکاڑہ میں آفس منیجر کی حیثیت سے بھی کام کیا لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ اس دوران انہوں نے پرائیویٹ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کر لیا۔

اسلم کولسری نہایت حساس طبیعت کے مالک اور دردِ دل رکھنے والے انسان تھے۔ وہ اپنے گاؤں کولسر کو بہت یاد کرتے جس کے نشانات معدوم ہو گئے تھے۔ اپنے چک کا ذکر کرتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتے۔ ان کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اُن پر کسی افسردہ شخص کی تصویر کا گمان ہوتا۔ اس اُداسی کے شیڈز ہمیں ان کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ جب اُن کے بیٹے محمد رضوان اسلم کی کم سنی میں وفات ہوئی تو انہوں نے نہایت پردرد اشعار کہے۔ اس غزل کا ایک شعر کچھ یوں ہے:

تم جانبِ ظلماتِ عدم چل دیے تنہا
بچے تو گلی میں بھی اکیلے نہیں جاتے

جب ۲۰۰۸ء میں پاکستان میں زلزلہ کی صورت میں قیامتِ صغریٰ برپا ہوئی جس میں ہزاروں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ معصوم بچے ریزہ ریزہ پہاڑوں کے پتھروں تلے دب کر پھولوں کی طرح مسلے گئے۔ جب ہر دل حزیں اور ہر آنکھ اشک بار تھی۔ پوری پاکستانی قوم اس عظیم سانحے سے گزر رہی تھی۔ شاعروں نے نہایت پردرد نظمیں لکھیں مگر سب سے زیادہ کولسری صاحب کی نظم مشہور ہوئی جو اشکوں سے لکھی گئی اور جس کو پڑھ کر آج بھی آنکھیں اشکوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ "عید آئی ہے بابا کفن بھیج دو"

عید آئی ہے
بابا! کفن بھیج دو

میرا منی کا، بھیا کا
امی اور پیاری دادی کا
بابا کفن بھیج دو
اب کے کمبل بچھونے نہیں چاہئیں
مجھ کو اپنے کھلونے نہیں چاہئیں
اپنی منی کو گڑیا نہیں چاہیے
کوئی خوشبو کی پڑیا نہیں چاہیے
کوئی پتلون، شرٹ اور گھڑی بھی نہیں
دادی ماں کے لیے اب چھڑی بھی نہیں
عید آئی ہے بابا کفن بھیج دو
میرا بستہ نجانے کہاں کھوگیا
میرے کپڑے نجانے کہاں دفن ہیں
ساری چڑیاں نجانے کہاں اُڑ گئیں
جانے سب آشیانے کہاں دفن ہیں
دادی اماں کے ہاتھوں میں تسبیح تھی
جانے اب اس کے دانے کہاں دفن ہیں
جو مرے پیارے بھیا کی آنکھوں میں تھے
وہ خوشی کے خزانے کہاں دفن ہیں
خیر!
اب ڈھونڈنا کیا؟
کفن بھیج دو
عید آئی ہے بابا!

کولسری صاحب نے اپنی تمام پریشانیوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے شاعری میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس شاعری میں نکالتے اور زندگی میں کسی سے کبھی کچھ نہیں کہتے تھے۔ ایک دوست کی زبانی اُن کی گھریلو اُلجھنوں اور پریشانیوں کے متعلق علم ہوا۔ مگر وہ اپنے حالات کا ذکر کسی سے نہیں کرتے تھے۔ بس شعر کہہ کے جی ہلکا کر لیتے تھے۔ اس لیے عملی زندگی میں تمام تر مستی کے باوجود وہ شعر کہنے کے معاملے میں ہمیشہ چست رہے۔

ان کے شعری مجموعے ایک تسلسل کے ساتھ شائع ہوئے۔ جن میں ''نخلِ جاں، کاش، ویرانہ، نیند، جیون، برسات، عنبر اور پنچھی'' شامل ہیں۔ پبلشر کے معاملے میں وہ بہت خوش قسمت رہے کہ انہیں ابتدا سے ہی مکتبہ تعمیر انسانیت جیسا پاکستان کا نہایت معتبر ادارہ میسر آیا جس کے مالک سعید اللہ صدیق نے ان کے شعری مجموعے اہتمام سے شائع کیے اور ان کی مناسب تشہیر بھی کی۔ جس کی وجہ سے کولسری صاحب کی شاعری قارئین تک پہنچی۔ اشاعت کا یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ حالانکہ اب تو شعری مجموعوں کی اشاعت سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔

یوں تو اسلم کولسری کی شاعری اور فن و شخصیت کے حوالے سے ہمارے عہد کے معتبر ادیبوں نے ان کی کتب کے فلیپز، دیباچے اور مضامین لکھے جن میں ڈاکٹر وزیر آغا، بانو قدسیہ، شہزاد احمد، پروفیسر عارف عبدالمتین، میرزا ادیب، سید ضمیر جعفری، خواجہ محمد ذکریا، ڈاکٹر آغا سہیل، افتخار عارف، مشفق خواجہ، ظفر اقبال، قمر اجنالوی، سرور مجاز، ڈاکٹر وحید احمد، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر سعادت سعید، خالد احمد، ڈاکٹر اجمل نیازی، خالد اقبال یاسر، عباس تابش اور دیگر شامل ہیں مگر معذرت کے ساتھ یہ ایسے مضامین ہیں جیسے شاعری کی ہر دوسری کتاب کے حوالے سے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ کوئی تحریر بھی اسلم کولسری کی شاعری اور شخصیت کی عکاس نہیں۔ اس حوالے سے سنجیدہ تنقیدی کام کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی ناقد ابھی تک اُن کی شاعری کے ان دیکھے جزیروں اور ان میں چھپے خزانوں کی تلاش میں نہیں نکلا۔ سب ہی ساحل سے سیپیاں چن کر لوٹ آئے ہیں۔ اس حوالے سے قابلِ تحسین ہیں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن جنہوں نے ''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' کے عنوان سے کتاب لکھ کر کسی نہ کسی حد تک تنقید اور دوستی کا حق ایک ساتھ ادا کر دیا ہے، ورنہ ان کا قاری تو ابھی تک ان کے مقبولِ زمانہ اس شعر کے سحر سے باہر نہیں آیا۔

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

وفات سے کچھ عرصہ قبل انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ مردم بیزار تو پہلے تھے مگر اب تو جیسے خود سے بھی بیزار ہو گئے تھے۔ بیمار بھی رہنے لگے مگر اپنی بیماری کے حوالے سے وہ بہت لاپروا ثابت ہوئے۔ اپنا موبائل نمبر بھی بند رکھتے تھے۔ رابطے کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ میں اُن سے ملنا چاہتا تھا، اُن کی عیادت کرنا چاہتا تھا، کچھ وقت اُن کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا مگر ملاقات کی کوئی راہ نہیں تھی۔ ایک روز میری یہ مشکل ناز اوکاڑوی صاحب نے آسان کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کسی ہوٹل پر کبھی کبھی آ کر بیٹھتے ہیں تو وہاں ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ بقول ان کے:

بظاہر گھر بھی ہے دفتر بھی ہے کچھ محفلیں بھی
فقیروں کے مگر اصلی ٹھکانے کون جانے

ناز اوکاڑوی صاحب کے ساتھ اُن سے ملاقات ہوئی۔ ان کا رنگ زرد ہو گیا تھا، کمزور بھی ہو گئے تھے۔ ان کی مصنوعی ہنسی اب ایک بیمار، پریشان اور ناکام شخص کی ہنسی تھی۔ میں نے کچھ وقت ان کے لہجے کی تھکن، بے ترتیب گفتگو اور ان کی بے بسی کے ساتھ گزارا۔ اُن کی یہ حالت دیکھی نہ گئی تو چلا آیا۔

اس کے بعد پی ٹی وی کے ایک مشاعرے میں ان سے ملاقات ہوئی۔ اس میں شرکت کے لیے وہ بمشکل پہنچے تھے۔ اسٹیج تک بھی لنگڑا کر گئے تھے۔ ان

CamScanner

کے بازو اور ٹانگ میں شدید تکلیف تھی۔ جس کا اثر زائل کرنے کی وہ بھرپور کوشش کر رہے تھے تاکہ مشاعرے میں موجود شعراء کو اس کا احساس نہ ہو مگر وہ اس میں ناکام رہے جس طرح زندگی میں وہ ناکام شخص تھے۔

ابرار ندیم نے فون پر اسلم کولسری کی وفات کی خبر سنائی۔ میں کافی دیر دم سادھے بیٹھا رہا۔ کاش جس طرح ہر دکھ کی کیفیت الگ ہوتی ہے اس طرح اس کا نام بھی الگ ہوتا تو میں اس دکھ کو کوئی منفرد نام دے سکتا جس سے میں گزر رہا تھا۔

ہمدمِ دیرینہ مظہر سلیم مجوکہ صاحب کے ساتھ جنازہ میں شرکت کی۔ ایک پیٹرول پمپ کے پہلو میں بجلی کے کھمبے کے نیچے اُن کا جنازہ پڑھا گیا جس میں گنتی کے افراد تھے جن میں چند شعراء بھی تھے۔

جب وہ اردو سائنس بورڈ کے ڈپٹی ڈائریکٹر تھے اور میری اُن سے ابتدائی ملاقاتیں تھیں۔ ایک روز دفتر سے چھٹی کے بعد ہم ایک ساتھ باہر آئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈرائیور کو بلائیں گے اور گاڑی پر چلے جائیں گے مگر وہ گیلری سے ایک پرانی سائیکل لے آئے۔ سگریٹ سلگایا۔ مجھے خدا حافظ کہا اور ہلکے ہلکے پیڈل اور سگریٹ کے کش لگاتے کوئی درد بھرا گیت مدھم آواز میں گاتے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اسی طرح آج ان کا جنازہ بھی میرے اندر سے سنائی دینے والے کسی درد بھرے گیت کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اُن کا ایک شعر ہے:

شام ہوئی اور سورج نے اک ہچکی لی
بس پھر کیا تھا کوسوں تک سناٹا تھا

میں اس دکھ بھرے خیال کے ساتھ گھر لوٹ آیا کہ میری کولسری صاحب کے ساتھ اب کبھی ملاقات نہیں ہو گی۔ چند روز بعد ہی جب میں اپنی لائبریری میں گیا تو میرے نام لکھے ہوئے ان کے شعری مجموعوں نے مجھے دوبارہ ان سے ملوا دیا۔ میرا یقین اس بات پر پختہ ہو گیا کہ اچھا شاعر کبھی نہیں مرتا۔ وہ ہمیشہ اپنے شعروں میں زندہ رہتا ہے۔

ابھی کھڑے ہی تھے سوچوں میں گھر بنائے ہوئے
ہجوم آ بھی گئے بیلچے اُٹھائے ہوئے

یہ دل تمام حوادث کا آزمایا ہوا
تمام حادثے اس دل کے آزمائے ہوئے

....

تیزاب تھا جو پورے بدن میں سما گیا
پڑتی اگر پھوار سلگتے ضرور ہم

....

مجھ سے بچھڑ نہ جائے جو مجھ سے ملا نہیں
اس خوف سے میں اُس کا پتہ پوچھتا نہیں

....

ایک انوکھا سپنا دیکھا ، نیند اُڑی
آنکھیں ملتے ملتے جیون بیت گیا

....

شمار ہی میں نہیں مسئلے مکینوں کے
مگر وہ لوگ کہ جن کے مکان تک بھی نہیں

....

محبت ہو تو جاتی ہے ذرا سی
پھر اُس کے بعد صدیوں کی اُداسی

....

ہجر کے جنگل میں آئی ہے پہلی رات درختو
کتنا سناٹا ہے چھیڑو کوئی بات درختو

❀❀❀

نسیمِ سحر/راول پنڈی

(نذر احمد فراز)

شہر میں بھڑکی ہوئی آگ بُجھاتے جاتے
چاہے اِس سعی میں ہم ہاتھ جلاتے جاتے

گھر سے رخصت جو ہوئے تھے تو یہ کرتے احساں
اِن منڈیروں سے پرندے بھی اُڑاتے جاتے

چند دن اور بھی ہوتے جو میسّر ہم کو
اپنے سینے پہ یونہی زخم لگاتے جاتے

دیکھ کر دل کے خرابے کو خیال آتا ہے
اِس کھنڈر پر جو نیا شہر بساتے جاتے !

سنگِ تعبیر سے ٹکرا لیا سر آخرِ کار
خود کو کب تک وہی اِک خواب دِکھاتے جاتے

اب تو محشر میں بھی ملنے کی نہیں ہے اُمید
"سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے"

وہ تو کچھ اپنے جنوں پر ہی تھا قابو، ورنہ
شہر بھر کو تری تصویر دِکھاتے جاتے

ہم سفر چھاؤں میں تھے مجھ سے جو آگے، ان کا
بس نہ چلتا تھا کہ سب پیڑ گراتے جاتے

لے گئے نام کی تختی بھی جو دروازے سے
اِس جگہ وہ کوئی کتبہ ہی لگاتے جاتے

عین ممکن ہے کہ پیکر ذرا اچھا بنتا
اور کچھ دیر اگر چاک گھُماتے جاتے

تیرگی میں بھی اُترتے ہوئے خواہش تھی یہی
لَو چراغوں کی ذرا اور بڑھاتے جاتے

روشنی مانگ کے ہم کاش ستاروں سے نسیم
اپنے اندر کی یہ تاریکی مٹاتے جاتے

امین اوڈیرائی/سندھ

پھر یوں ہوا کہ ضبط کے پہلو نہیں رہے
پھر یوں ہوا کہ اشک بھی قابو نہیں رہے
پھر یوں ہوا کہ ہجر نے واپس بلا لیا
پھر یوں ہوا کہ دشت میں آہو نہیں رہے
پھر یوں ہوا کہ آہ کی رفتار تھم گئی
پھر یوں ہوا کہ وقت کے بازو نہیں رہے
پھر یوں ہوا کہ درد نے خاموشی اوڑھ لی
پھر یوں ہوا کہ آنکھ میں آنسو نہیں رہے
پھر یوں ہوا کہ شہر کا موسم بدل گیا
پھر یوں ہوا کہ رات میں جگنو نہیں رہے
پھر یوں ہوا کہ خود کو تلاشا نہیں گیا
پھر یوں ہوا کہ بن میں وہ سادھو نہیں رہے
پھر یوں ہوا کہ پیار کہیں کھو گیا امین
پھر یوں ہوا کہ ہم بھی من و تو نہیں رہے

نہ پوچھ کیسے مرے دوست جنوری میں رہا
رہِ حیات پہ تنہا میں فروری میں رہا
نگاہ مارچ میں کرتی رہی تمھاری تلاش
اسی لیے مرا اپریل بے گھری میں رہا
مئی کی گرم ہواؤں نے جسم جھلسایا
کہ جون میں بھی ہوائے ستمگری میں رہا
ترے بغیر جولائی وہ گھن گرج بادل
اگست اور بھی بارش کی برتری میں رہا
خزاں تھی میں تھا ستمبر تھا اور اکتوبر
یہ رختِ سانس بھی گودستِ آذری میں رہا
عجیب حال ہوا تھا مرا نومبر میں
بڑا ہی سرد دسمبر برابری میں رہا
کچھ اس طرح سے گزارا ہے سال ہم نے امین
ہر ایک لمحہ ستاروں کی مخبری میں رہا

بے سہارا تھا دل زمانے میں
چھوڑ آئے یتیم خانے میں
ایک لمحے میں توڑتے ہو جسے
عمر لگتی ہے گھر بنانے میں
جس کا یارو تھا مرکزی کردار
ذکر اس کا نہیں فسانے میں
ایک چہرہ تو اب بھی رہتا ہے
میری آنکھوں کے آستانے میں
اُن کی معصومیت پہ مت جانا
وہ تو ماہر ہیں دل جلانے میں
ہے زمیں آسمان کا فرق امین
آئنہ دیکھنے دکھانے میں

خامشی میں خطیب لگتا ہے
وہ تو کوئی ادیب لگتا ہے
تم نہیں ہو مرے قریب تو پھر
کون ہے جو قریب لگتا ہے
آج رخصت کیا ہے بیٹی کو
آج تو گھر عجیب لگتا ہے
خالی خالی ہے غم کی دولت سے
دل تمھارا غریب لگتا ہے
تُو نے بالوں میں جو سجایا ہے
پھول مجھ کو رقیب لگتا ہے
آنکھ کے وار سے بچا کیسے
تو کوئی خوش نصیب لگتا ہے
گزرے لمحوں کو یاد کر کے امین
لمحہ لمحہ صلیب لگتا ہے

مائلِ شہرِ طلسمات نہیں ہو سکتی
دوراب مجھ سے مری ذات نہیں ہوسکتی
آپ نے توڑ دیے سارے ہی بندھن پل میں
آپ سے اب تو کوئی بات نہیں ہوسکتی
اپنے سر کو جو ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہے
ایسے عاشق کو کبھی مات نہیں ہو سکتی
چھوڑ آیا ہوں ترے در پہ میں آنکھیں اپنی
اس سے بڑھ کر کوئی سوغات نہیں ہوسکتی
ہاتھ تھامے ہوئے رو رو کے کہا تھا اس نے
آج کے بعد ملاقات نہیں ہو سکتی
بانٹتا ہے جو سرِ شہر اجالوں کو امین
اُس کے جیون میں کبھی رات نہیں ہوسکتی

مائلِ شہرِ طلسمات نہیں ہو سکتی
دُور اب مجھ سے مری ذات نہیں ہوسکتی
آپ نے توڑ دیے سارے ہی بندھن پل میں
آپ سے اب تو کوئی بات نہیں ہوسکتی
اپنے سر کو جو ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہے
ایسے عاشق کو کبھی مات نہیں ہو سکتی
چھوڑ آیا ہوں ترے در پہ میں آنکھیں اپنی
اس سے بڑھکر کوئی سوغات نہیں ہوسکتی
ہاتھ تھامے ہوئے رو رو کے کہا تھا اس نے
آج کے بعد ملاقات نہیں ہو سکتی
بانٹتا ہے جو سرِ شہر اجالوں کو امین
اُس کے جیون میں کبھی رات نہیں ہوسکتی

شہزاد تابش/لاہور

زباں پر چپ کے پہرے ہیں تو ہے زنجیر پیروں میں
گھٹن کی اس فضا میں ہم اشارے بانٹ لیتے ہیں

شب تیرہ کی سیاہی پہ ضیا لکھی ہے
ڈرے سہمے ہوئے چہروں پہ نوا لکھی ہے
مرے حاکم نے مری جب سے زباں کاٹی ہے
میں نے زنجیر کی کڑیوں پہ صدا لکھی ہے
دل نے ہر وقت خزاؤں سے بغاوت کر کے
جس میں سب کے لیے تازہ ہوا لکھی ہے
چاک دامن کو میسر نہیں اترن لیکن
اہل زر کے لیے ریشم کی قبا لکھی ہے
میں نے یہ سوچ کے رشتہ نہ صبا سے رکھا
مری تقدیر میں آنچل کی ہوا لکھی ہے
چھوڑ کے جاتے ہوئے یہ تو بتانا تھا مجھے
کون ہے جس کے مقدر میں وفا لکھی ہے
بخش ہی دے گا وہ محشر میں گنہگاروں کو
جس نے حکمت سے جبلت میں خطا لکھی ہے
مجھ کو معلوم نہیں کیسی خطا پر تابش
وقت کے ہاتھ نے خود میری سزا لکھی ہے

محبت کے وفا کے استعارے بانٹ لیتے ہیں
سکونِ دل کی خاطر درد سارے بانٹ لیتے ہیں
ذرا سوچو بھنور نے آج تک کس کو بچایا ہے
مناسب ہے یہیں پر ہم کنارے بانٹ لیتے ہیں
یہ سورج کی قرابت جسم کو جھلسا بھی سکتی ہے
تو یوں کرتے ہیں آپس میں ستارے بانٹ لیتے ہیں
زمیں پر چیختی انسانیت آواز دیتی ہے
کہاں ہیں وہ جو مشکل میں سہارے بانٹ لیتے ہیں
زمیں احساس کی دولت سے جنت بن بھی سکتی ہے
جو اہل زر غریبوں سے خسارے بانٹ لیتے ہیں
زباں پر چپ کے پہرے ہیں تو ہے زنجیر پیروں میں
گھٹن کی اس فضا میں ہم اشارے بانٹ لیتے ہیں
مرے کچھ حاکموں کا یہ ازل ہی سے وطیرہ ہے
زبانیں کاٹ دیتے ہیں اجارے بانٹ لیتے ہیں
ہماری سادگی نے اس قدر دھوکہ دیا ہم کو
کہ پھولوں کی طلب میں ہم شرارے بانٹ لیتے ہیں
تمہیں معلوم کیا کہ ہم شکم کی بھوک کے ہاتھوں
زمین غیر سے آنکھوں کے تارے بانٹ لیتے ہیں
مری خوشیاں تمہارے غم ملا کر اک جگہ تابش
جو ممکن ہے تو ہم سارے کے سارے بانٹ لیتے ہیں

جسے دیکھو وہی بجھتی جلانے بیٹھ جاتا ہے
نمک ہر کوئی زخموں پر لگانے بیٹھ جاتا ہے
جو خود بھٹکا ہوا ہے زندگی کے راستے پر وہ
مجھے منزل کے سب نقشے دکھانے بیٹھ جاتا ہے
اگر ہم روٹھ بھی جائیں الجھ کر ایک دوجے سے
اسے میں اور دل مجھ کو منانے بیٹھ جاتا ہے
مجھے ازبر ہے اس کی داستان غم مگر پھر بھی
مسیحا وہ سمجھتا ہے سنانے بیٹھ جاتا ہے
ہزاروں بار لٹ کر دل محبت کے جزیروں پر
اسی کے در پہ زخم دل دکھانے بیٹھ جاتا ہے
بڑی مشکل سے اٹھتا ہے تری یادوں کی محفل سے
تجھے پھر غم سنانے کے بہانے بیٹھ جاتا ہے
مہارت غم چھپانے کی اسے ہے اس قدر سب سے
کہ میت گھر میں ہو پھر بھی ہنسانے بیٹھ جاتا ہے
تکبر جب بدن میں پھیلتا ہے زہر کی صورت
کلاہِ خسروی دنیا جھکانے بیٹھ جاتا ہے
جہاں طاقتوروں کے ہاتھ ہو زنجیر عادل کی
وہیں قانون مفلس کو دبانے بیٹھ جاتا ہے
جو دنیا تجھ پہ ہنستی ہے تو اب ناراضگی کیسی
سبھی کو دل کے قصے کیوں سنانے بیٹھ جاتا ہے
جلے خوابوں کی تابش خاک ہے بس تیرے دامن میں
ستم اس پر کہ تو اس کو اڑانے بیٹھ جاتا ہے

پیروں کے آبلوں کو یوں دھوکے دیئے گئے
منزل کی ہر نوید پہ رستے دیئے گئے
بھاؤ ہر ایک جنس کا اچھا تھا شہر میں
انسان پھر بھی مٹی سے سستے دیئے گئے
راہوں کے سب چراغ جلانے سے پیش تر
میرے جگر کے خون سے بھر کے دیئے گئے
ممکن نہیں تھا جن کی مسافت سے لوٹنا
ان منزلوں کے مجھ کو نوشتے دیئے گئے
ہر اک سفیر خیر کے مثبت سوال پر
نام خدا جواب ہی شر سے دیئے گئے
کچھ دشت کا سفر بھی مقدر بنا رہا
کچھ نین تیری دید کے ترسے دیئے گئے
آتا ہے جس کو عشق میں سوداگری کا فن
اس کو وفا شناس کے تمغے دیئے گئے
تابش مقام شکر کہ اس مشت خاک کو
روشن جبیں کے ساتھ ہی سجدے دیئے گئے

درویش کی پکار پہ خود مرثیہ پڑھا
دنیا ترے وقار پہ خود مرثیہ پڑھا
پہلے تری جفاؤں کا دل نے منایا سوگ
پھر اپنے اعتبار پہ خود مرثیہ پڑھا
اتنے شدید وار تھے پشت غنیم پر
ہر ایک یار غار پہ خود مرثیہ پڑھا
مسلے ہوئے گلاب کی چیخ و پکار پر
پھولوں کے لالہ زار پہ خود مرثیہ پڑھا
ہم نے دل تباہ کی بے چارگی لیے
الفت کے ہر مزار پہ خود مرثیہ پڑھا
کلیوں نے کیوں بہار کی آمد سے پیش تر
پھولوں کی رہ گزار پہ خود مرثیہ پڑھا
مجبور مامتا نے شرافت کو بیچ کر
دامن کے تار تار پہ خود مرثیہ پڑھا
ناکام حسرتوں کے نشیب و فراز میں
چڑھتے ہوئے خمار پہ خود مرثیہ پڑھا
شعلوں کی زد میں چیختی جنگلی حیات نے
شعلوں کے ہر شرار پہ خود مرثیہ پڑھا
تابشِ جنون و عقل کی تکرار تھی فضول
دونوں کے اختصار پہ خود مرثیہ پڑھا

اس عالمِ امکان کا ہے کیونکہ خدا ایک
وہ بخش دے، لب پر ہے مرے بس یہ دعا ایک
وہ عشق نہیں ہے کہ جو ہو جائے ہر اک سے
ہوتا ہے فقط مرکزِ تسلیم و رضا ایک
ملتا وہ کہیں بھی نہیں، بس دل کے علاوہ
دنیا میں خدا کا ہے فقط دل ہی پتہ ایک
ہوں ساری دعائیں مری پوری مرے یارب
ہونٹوں پہ مسلسل ہے مرے یہ بھی دعا ایک
لَو اس سے لگانا ہی ہے ہر غم کا مداوا
ہر درد کی ہوتی ہے فقط یہ ہی دوا ایک
ہو رنگ کوئی، کوئی بھی ہو مذہب و ملت
سب اُس کی ہی مخلوق ہیں، ہے سب کا خدا ایک
ہر درد کا درماں ہو یہ خواہش تو ہے دل کی
پر درد کے ہونے میں بھی ہوتا ہے مزا ایک
جب رات اندھیری ہو تو اُمید کا قیصر
رہ جاتا ہے جلتا ہوا سینے میں دیا ایک

بچھڑ کے اس سے، یہ مانتا ہوں، مجھے بھی غم تھا، پچاس فیصد
قصور میرا بھی سارے قصے میں کم سے کم تھا پچاس فیصد
مری بھی آنکھوں سے چند آنسو نکل کے پلکوں پہ آ گئے تھے
اور اس کا چہرہ بھی لگ رہا تھا مجھے کہ نم تھا، پچاس فیصد
پچاس فیصد تھی مسکراہٹ، جو مجھ پہ جادو سا کر گئی تھی
اور اس میں شامل، وہ اس کے لہجے کا زیر و بم تھا، پچاس فیصد
جہاں وہ بھٹکا، پچاس فیصد مرے مقدر کا پھیر تھا وہ
جہاں میں اُلجھا، وہ اس کی زُلفوں کا پیچ و خم تھا پچاس فیصد
نہیں کہ گل پیرہن نہیں تھا، وفا کا اس میں چلن نہیں تھا
جبھی تو میزانِ آرزو میں، وہ محترم تھا پچاس فیصد
جو اس کی آنکھوں میں اک نشہ تھا، پچاس فیصد مرا گماں تھا
نظر کا اس کی، مگر وہ ساغر بھی جامِ جم تھا، پچاس فیصد
محبتوں میں عبادتیں تھیں، عبادتوں میں محبتیں تھیں
صنم خدا تھا پچاس فیصد، خدا صنم تھا پچاس فیصد
کبھی رُلا کر گلے لگایا، گلے لگا کر کبھی رُلایا
کبھی کرم تھا پچاس فیصد، کبھی ستم تھا پچاس فیصد
بچھڑ کے مجھ سے پچاس فیصد وہ کیونکہ خوش تھا، مجھے خوشی تھی
پچاس فیصد میں غم زدہ تھا اسے یہ غم تھا پچاس فیصد
ستم سمجھتے تھے وہ کرم کو، کرم سمجھتے تھے ہم ستم کو
ستم کرم تھا پچاس فیصد، کرم ستم تھا پچاس فیصد
پچاس فیصد خوشی تھی غم میں، پچاس فیصد تھا غم خوشی میں
وہ غم زدہ تھا فقط کہ جس کو لگا کہ کم تھا پچاس فیصد
نظر نے دیکھا جو دردِ قیصر، تو دونوں اس میں بھی تھے برابر
ارادہ اس کا پچاس فیصد، مرا قدم تھا پچاس فیصد

جہاں کا پھول ہوں میں اس چمن میں رہتا ہوں
وطن سے دور ہوں لیکن وطن میں رہتا ہوں
نہ ڈھونڈ مجھ کو کہیں اور اے نسیمِ سحر
شمیمِ گل ہوں میں، سرو و سمن میں رہتا ہوں
وہاں نہیں ہوں مگر دل وہیں پہ ہے میرا
اکیلا ہوں میں مگر انجمن میں رہتا ہوں
پہن رکھی ہے دل و جاں نے دیس کی خوشبو
جہاں بھی جاؤں اسی پیرہن میں رہتا ہوں
وہ جس نے گود میں پالا تھا مجھ کو بچپن میں
میں آج بھی اُسی کوہ و دمن میں رہتا ہوں
سجائے رکھتا ہوں یادوں کی بزم کو دل میں
ہمیشہ محفلِ شیریں سخن میں رہتا ہوں
وہ اُس کی نقرئی صبحیں، وہ سرمئی شامیں
میں شہرِ زیست کے ہر بانکپن میں رہتا ہوں
مرے مزاج سے واقف وہی تو ہیں قیصر
رہوں کہیں بھی میں اہلِ سخن میں رہتا ہوں

یاد کا ننھا دیا مژگاں پہ اختر ہو گیا
بھولنا جس شخص کو چاہا مقدر ہو گیا
پیاس اتنی بڑھ گئی کہ پیاس ہی جاتی رہی
دشتِ حسرت شدتِ غم سے سمندر ہو گیا
تمتماتے گال پر شبنم گری جو اشک کی
گل تھا اس معصوم کا چہرہ گلِ تر ہو گیا
توڑ ڈالا ایک لمحے نے فصیلِ صبر کو
آنکھ سے جو اشک نکلا تھا وہ ساگر ہو گیا
بستی بستی ڈھونڈتا پھرتا تھا میں اپنا پتہ
سانس ٹوٹا جس نگر میں وہ مرا گھر ہو گیا
میرا ڈر، میری ہوس، میری انا، میرا غرور
میں خود اپنے آپ میں دشمن کا لشکر ہو گیا
ڈر تھا دشمن کا مجھے یا ڈر ہی تھا دشمن مرا
مار ڈالا خوف کو جس نے سکندر ہو گیا
اک نظر دیکھا تھا اس کو پھر نہ جانے کیا ہوا
دل بھی خود پھر اختیارِ دل سے باہر ہو گیا
دل کے دروازے کے اندر فرش تھا کچا مگر
اس نے جب رکھا قدم تو سنگِ مرمر ہو گیا

تعاقب

پروفیسر نور کمال شاہ

بلندی سے اچھلتا پانی کا دھارا سنگلاخ سیاہ چٹانوں کو پھلانگتا اور چھینٹے اڑاتا ہوا آبشار کی شکل میں نیچے گر رہا تھا جہاں صاف وشفاف پانی کی چھوٹی جھیل سی بن گئی تھی۔گرمیوں کے موسم میں چوٹی پہ موجود برف کے پگھلنے اور ساون میں بارشوں کے باعث اس پانی کے بہاؤ میں تیزی آجاتی۔یہاں سے یہ پانی پتلی سی پہاڑی نالیوں کی صورت میں نیچے کی جانب بہہ نکلتا تھا۔تالاب اور آبشار کے اردگرد کا خطہ کافی سرسبز تھا اور یہاں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی بکھری پڑی تھی۔بے ترتیبی سے اگے بے شمار خودرو پودے پھیلے ہوئے منظر کو دل نشین بنا رہے تھے۔فطرت کی دلاویزی سے مزین یہ حسین اور دلکش جگہ ٹھنڈی اور سایہ دار تھی۔پہاڑ پر چرنے والے ڈور ڈنگر اپنی پیاس بجھانے کے واسطے یہاں پانی کے گرد جمع ہوتے اور ستانے کے لئے یہاں اگے درختوں اور گھنی جھاڑیوں کے سائے میں کچھ وقت کے لئے اپنی ٹانگیں لپیٹ کر لیٹ بھی جاتے۔پانی اور سائے کی تلاش میں اڑان بھرنے والی چڑیاں، فاختائیں، کبوتر اور دیگر بہت سے پرندے یہاں کے گھنے بلند وبالا درختوں کی ٹہنیوں میں ادھر ادھر پھدکتے اور خوشی سے چہچہاتے رہتے۔گرتے پانی کی پرشور آواز پرندوں کے دلکشا نغموں کے ساتھ مل کر عجب سماں باندھ دیتا تھا۔پہاڑ پر گھاس اور سوختنی لکڑیاں جمع کرنے والے لڑکے بالے اور بھیڑ بکریاں چرانے والے چرواہے اپنے ریوڑ سمیت تیز دھوپ سے اکتا کر دوپہر کو یہاں کا رخ کرتے۔دن بھر بکریاں چرانے والے چرواہے یہاں کی ٹھنڈی چھاؤں میں اپنی چادر کے پلو میں باندھی روٹی کھولتے اور پانی کے کنارے بیٹھ کر کھالیتے۔اس وقت بھی کچھ گائیں اور بھیڑ بکریاں تالاب کے پانی سے پیاس بجھانے کے بعد ادھر ادھر جھاڑیوں میں منہ مار رہی تھیں۔آبشار سے اچھلتے پانی کے زور سے چٹانوں میں موجود پودوں اور جھاڑیوں کی لمبی شاخیں تیز بوچھاڑ کی زد میں یوں تیزی سے آگے پیچھے جھوم رہی تھیں جیسے الہڑ جوانیاں مدھر موسیقی کی لے پر رقصاں ہوں۔

شمروز خان نے اپنی چادر اور بندوق کندھے سے اتار کر وہیں پانی کے کنارے رکھ دی اور آستینیں چڑھا کر ہاتھ دھونے کے بعد اپنے منہ پر بھی پانی کے چند چھینٹے مارے۔دونوں ہاتھوں کے چلو میں پانی بھر کر پی لیا اور الحمد اللہ کا کلمہ شکر ادا کرنے کے بعد وہیں ہموار گھاس کے تختے پر ایک بھاری پتھر سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔وہ بہت تھک گیا تھا۔صبح ہی سے وہ ان پہاڑوں میں گھوم رہا تھا اور اب تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔تھوڑے آرام کے بعد واپسی کا سفر شروع ہونا تھا۔آج بھی اس کا مقصد حل نہ ہوسکا تھا اور وہ جہانگیر کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

شمروز خان آنکھیں بند کئے سوچوں میں گم تھا۔اپنے خون میں لت پت بھائی کا چہرہ اس کے تصور سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔شاندانہ کا دوٹوک مطالبہ بھی اسے آرام نہیں کرنے دے رہا تھا۔جہانگیر اس کے بھائی کا قاتل تھا۔پچھلے تین مہینوں سے وہ اس کی تلاش میں تھا مگر پتہ نہیں وہ کہاں چھپا بیٹھا تھا۔جہانگیر کو بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ موت سائے کی طرح اس کا تعاقب کر رہی ہے اور وہ اسے ٹالنے کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور تھا مگر آخر کب تک؛ ایک نہ ایک دن تو اسے شمروز خان کی گولی کا سامنا کرنا ہی تھا۔جرگے ناکام ثابت ہو چکے تھے۔صلح کی تمام کوششیں بے کار جا چکی تھیں۔اس کے ہاتھ سے شمروز خان کے بڑے بھائی گل روز خان کا قتل ہو چکا تھا اور وہ بھی معمولی تکرار پر۔شدید پچھتاوا گل روز کی موت کا صلہ نہیں بن سکتا تھا۔گل روز خان جس کی شادی کو چھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے اپنے ہی خون میں رنگ کر نئی نویلی دلہن شاندانہ کو بیوہ چھوڑ گیا تھا شاندانہ نے گل روز خان کی موت کے بعد کڑی شرط پر شمروز خان کی دلہن بننا قبول کیا تھا کہ یہی پختونوں کا رواج تھا اور یہی ان کے قبیلے کا دستور بھی تھا۔مقتول شوہر کی وفادار بیوی نے شوہر کا قاتل مانگ لیا تھا۔شاندانہ نے سہاگ رات کو ہی نکاح کے مہر میں جہانگیر کا سر مانگ لیا تھا اور شمروز خان نے شرط پوری کرنے کا اقرار بھی کر لیا تھا۔

بھائی کے قتل کے دن سے ہی شمروز خان قاتل کی کھوج میں تھا۔جس کام سے بھی وہ نکلتا، اس کے ہاتھ میں اسلحہ ضرور ہوتا مگر جہانگیر کہیں روپوش ہو چکا تھا اور اب وہ اتنی آسانی سے اس کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔شمروز خان نے علاقے میں مخبر بھی پھیلا رکھے تھے مگر ابھی تک کوئی حوصلہ افزا اطلاع اس تک نہیں پہنچی تھی۔شمروز خان نے جہانگیر کی تلاش میں علاقے کا چپہ چپہ چھان مارا تھا مگر اسے کامیابی نہیں ملی تھی اور آج بھی وہ ایک خفیہ اطلاع پر قریبی بلند وبالا پہاڑ کی چٹانوں میں اس کی تلاش میں اوپر چڑھ آیا تھا جہاں بلندیوں پر چھپنے کے لئے گھنے درخت بھی موجود تھے اور پیاس بجھانے کے لئے صاف وشفاف پانی کے چشمے بھی۔

آدھے گھنٹے کے آرام کے بعد شمروز خان اٹھ کھڑا ہوا اور بستی کو واپسی کا قصد کیا۔بندوق اس نے کندھے سے لٹکا دی اور اس کے اوپر چادر کا پلو ڈال کر روانہ ہوا۔اسے اب جھاڑیوں اور پہاڑی پودوں کے درمیان بنے پتلے پتھریلے رستے سے نیچے بستی کی جانب اترنا تھا۔سامنے پہاڑی درے تک پہنچنے کے بعد اس کی بستی کو ایک پتلا سا راستہ نیچے پہنچاتا تھا جہاں سے چند سو میٹر نیچے اس کا گھر تھا۔

پہاڑی کا پہلا موڑ مڑتے ہی وہ اسے نظر آگیا؛

شائد وہی تھا.....

نہیں نہیں، یقیناً وہی تھا......

CS CamScanner

چوکنا اور ہشیار۔۔۔

احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا۔۔۔۔

چال میں خوف نمایاں۔۔۔

پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا مگر رفتار میں تیزی اور بے قراری۔۔۔۔

درمیانی فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ اسے چہرے بشرے سے پہچاننا اور شناخت کرنا ممکن نہیں تھا مگر ہاں وہ جہانگیر ہی تھا۔۔۔۔۔۔۔

اسے پہچاننے میں وہ غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بستی کے قریب پہنچ چکا تھا، شاید خاموشی سے اپنے گھر کی جانب نکل کر جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

شمروز خان کا اسلحہ کندھے سے اتر کر اس کے ہاتھوں میں سما گیا۔ اور وہ دیوانہ وار نیچے کی جانب لپکا۔ کچا پہاڑی راستہ چھوڑ کر پودوں اور جھاڑیوں کو پھلانگتا وہ نسبتاً مختصر راستے پر اترتا چلا گیا۔ دوڑتے قدموں کی دھمک سے پودوں کی جھنڈ میں بچوں سمیت بیٹھے پہاڑی پرندے بچوں کو چھوڑ کر پر پھڑپھڑاتے ہوئے مختلف سمتوں کو جا اڑے۔ جھاڑیوں میں چھپی بیٹھی خرگوش خوفزدہ ہو کر اپنی سوراخ سے نکلی اور اچھلتی ہوئی ایک طرف کو بھاگ کھڑی ہوئی۔ ایک بھاری پتھر شمشیر کے بھاگتے قدموں سے الجھ کر مہیب آواز کے ساتھ بے تحاشا نیچے کی جانب لڑھکتا چلا گیا۔

جہانگیر کو شاید خطرے کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ آمدہ صورت حال کو بھانپ گیا تھا۔ اس وقت وہ پہاڑ کے بالکل نیچے آبادی کے پاس پہنچ چکا تھا جہاں پر بستی کے بہت سے بچے جمع ہو کر کرکٹ کھیل رہے تھے۔ یہاں پر مقابلہ یا فائرنگ کسی طور مناسب نہیں ہو سکتی تھی۔ جہانگیر کسی طرح نکلنے کے چکر میں تھا اور وہ مزید خون خرابا بالکل نہیں چاہتا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا مگر ندامت نے اسے کمزور بنا دیا تھا۔ اوپر سے شمروز خان آندھی بن کر اس کے سر پر پہنچنے والا تھا۔

بستی کے پہاڑی جانب بنے مکانات میں کچی سڑک کے کنارے شمروز کا حجرہ تھا جو مکان کا مردانہ حصہ تھا اور مہمانوں کے لئے مخصوص تھا، اندر کی جانب زنانہ حصہ تھا۔ تیزی سے گھر کی جانب بڑھتے جہانگیر کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس وقت اپنے گھر تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اس کے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں بھری پستول موجود تھی مگر اپنی زندگی بچانے کی تگ و دو میں وہ فی الحال کسی قریبی جائے پناہ کی تلاش میں تھا اور پھر وہ اچانک ہی شمروز کے حجرے میں جا گھسا کہ یہی دروازہ اسے کھلا نظر آیا تھا اور اپنے پیچھے بڑا گیٹ بند کر دیا۔

بستی کے مکین جو اس وقت آس پاس موجود تھے، اچانک تیزی سے رونما ہونے والے حالات کو سمجھ چکے تھے۔ وہ عنقریب واقع ہونے والے واقعے کے متعلق فکرمند تھے۔ صورت حال ڈرامائی بن چکی تھی۔ قاتل خود مقتول کے گھر میں موجود تھا اور اب اس کا بچنا بڑا مشکل تھا۔ تیزی سے بھاگتے شمروز خان کے قدم رکے نہیں۔ وہ جان چکا تھا کہ جہانگیر کہاں پر داخل ہو چکا ہے اور اپنے پیچھے حجرے کا دروازہ بھی بند کر چکا ہے۔ وہ بھاگتے بھاگتے چیتے کی طرح لپکے اور حجرے کی دیوار پھاند کر اندر کود گئے۔ حجرے کے سامنے کھڑے دو تین بزرگوں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر بے سود۔

”نا۔۔۔ نا شمروز خانہ۔۔۔۔! وہ تمہارے حجرے میں ہے۔۔۔۔۔۔“ حاجی برکت نے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔ بابا نعمت اللہ نے جو بستی کے معزز اور معمر شخص تھے ان کے بندوق پہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ اسے چھڑا کر نکل گئے۔ اس وقت وہ کسی کے قابو میں آنے والے نہیں تھے۔ اندر خاموشی چھا گئی تھی۔ ساری نگاہیں حجرے پر مرکوز تھیں اور کان اندر برپا ہونے والے متوقع ہنگامے پر لگے تھے۔ شمروز کے گھر اور پڑوس کی خواتین بھی چھت پر چڑھ کر حجرے کے اندر جھانک رہی تھیں۔ چند گولیاں خاموشی کا سینہ چیرتے ہوئے فضا میں تڑتڑائیں؛ چھت پر موجود عورتیں گھبرا کر پیچھے کو بھاگ کھڑی ہوئیں، ساتھ ہی شمروز خان کی دلدوز چیخیں فضا میں گونجنے لگیں۔ شدید خوف اور بے چینی کے عالم میں ایک دو نوجوان حجرے کی دیوار پر چڑھے، اندر کی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی اور چند ثانیے بعد ایک نوجوان نے نیچے اتر کر حجرے کا باہر والا دروازہ کھول دیا۔ موقع پر موجود بزرگ اور نوجوان تیزی سے حجرے کے اندر داخل ہوئے۔ حیرت ناک منظر سامنے تھا۔ صحن کے بیچوں بیچ جہانگیر اپنی پستول سامنے گرائے بے جان اور بے حس و حرکت کھڑے تھے جبکہ اس سے کچھ فاصلے پر شمروز خان گھٹنوں کے بل بیٹھے اپنی بندوق زمین میں گاڑے بلند آواز سے چیخ رہے تھے؛ اس کی چیخیں آسمان کا سینہ چیر رہی تھیں۔

بابا نعمت اللہ شاید وقوعے کو سمجھ چکے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر پستول اٹھایا اور خاموشی سے جہانگیر کو حجرے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ جہانگیر کے چلے جانے کے بعد وہ دوسرے بزرگوں کے ساتھ شمروز خان کو سنبھالنے آگے بڑھے۔ بندوق جس کی تمام گولیاں پہلے ہی فضا میں غائب ہو چکی تھیں ہٹا لی گئی اور شمروز خان کو سہارا دے کر کھڑا کیا گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں؛ اور وہ زار و قطار رو رہے تھے۔ بابا نعمت اللہ کی آنکھیں بھی بھیگ چکی تھیں۔ اس نے اپنی پگڑی کے پلو سے شمروز خان کے آنسو پونچھے اور کہنے لگے:

”بس میرے بچے بس! صبر کر؛ مجھے پتہ تھا تم پختون روایات کو کبھی مجروح نہیں ہونے دو گے؛ ہمیں اپنے اقدار بے حد عزیز رہی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ تم اپنے حجرے میں جہانگیر پر کبھی گولی نہیں چلاؤ گے اور تم نے ایسا ہی کیا؛ وہ تمہاری پناہ میں آچکا تھا۔ مجھے تم پہ فخر ہے میرے بیٹے۔۔۔۔۔۔!!! آج پورا گاؤں تجھ پہ فخر کر رہا ہے۔“

شمروز خان بے جان لاشے کی مانند بھیگی آنکھوں کے ساتھ بابا نعمت اللہ کے بازوؤں میں جھول رہے تھے اور شاندانہ اسے سنبھالنے کے لئے حجرے میں داخل ہو چکی تھی۔

میں کاشر

کلیم خارجی

وہ سفید بادلوں کے نیچے سبز پہاڑیوں کے درے سے برآمد ہو کر وادی میں اچھل اچھل کر چیخنے لگا تھا جو اس نے دور سے ایک لمبے اور سیاہ فام گڈریے کو آتا دیکھ لیا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر کسی کو للکارنا شروع کر دیا۔ گڈریا ابھی بہت دور تھا۔ اُسے اپنی بھیڑوں کے کم سن بچوں کی فکر تھی۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے رُک جاتا۔ اور گردن موڑ کر میمنوں کو چکارنے لگتا اس نے وادی میں اُترنے والے نئے چھلاوے کی چیخ و پکار پوری طرح نہیں سنی تھی۔ لیکن اپنی طرح کا ایک انسان دیکھ کر وہ بغیر سوچے سمجھے اسکی طرف بڑھنے لگا تھا۔ وادی میں اُترنے والے چیختے ہوئے آدمی نے چمکتی سفید ندی کے کنارے عجیب و غریب پھول دیکھ کر اپنی رانیں پیٹنا شروع کر دیں۔ پھر اس نے ایک چھوٹی سی سبز پہاڑی پر پہلی مرتبہ ایسے پرندے دیکھے جنکے ناموں سے وہ نا آشنا تھا۔ وہ ان کی چہکاروں، رقص اور دھوپ میں پھیلتے رنگوں کو دیکھ دیکھ کر سسکیاں بھرنے لگے۔ پھر اس نے سیاہ اور بلند قامت گڈریے کو اپنی طرف آتا دیکھ لیا تو سجدے میں گر کے بلند آواز سے بین کرنے لگا گڈریے نے اسکے اضطراب بھری اور تکلیف دہ آوازیں سن کر اپنے قدم تیز کر دیئے۔ اور بہت جلد وہ اسکے قریب پہنچ کر ہمدردی اور خلوص سے دیکھتے ہوئے بولا۔ میری وادی میں اُترنے والے مہمان خوش آمدید۔

اُس نے سجدے میں پڑے پڑے گردن اُٹھائی اور اُسے کچھ دیر حیرت سے دیکھتے ہوئے دوبارہ بے نیازی سے سجدے میں گر پڑا۔ وہ صاف اور دھمکی آمیز لہجے میں دُعا کرتے ہوئے بولا۔ اے میرے معبود، میں نے ساری عمر تیری عبادت کو اپنی ترجیح سمجھا۔ تو نے جو چاہا میں نے کیا۔ تو نے جس سے منع کیا۔ میں باز رہا۔ میں تیرے حکم کے مطابق کھاتا پیتا جیتا نہاتا اور زندگی برتتا رہا۔ میں اپنا لباس معطر اور جسم صاف رکھتا رہا۔ تاکہ تیری منشاء مجھ پہ نازل رہے۔ لیکن تو نے ہمیشہ مجھے بھیانک، بے رحم، بھوکے اور لوگوں کے درمیان رکھا۔ تو نے ہماری زمین پہ سورج کو دہکائے رکھا۔ تو گرم تپتی ہوئی مٹی میں زہریلے کیڑے مکوڑوں اور خطرناک درندوں کو بسائے رکھا۔ تو نے عمر بھر میری ریاضت کا کبھی صلہ نہیں دیا۔ آسمان کو زرد اور شعلہ زن رکھا۔ جبکہ یہاں کا آسمان بہت نیلا اور دلکش ہے یہ آسمان ایسا کیوں ہے جبکہ میرے سر پہ جو آسمان تھا وہ زرد مٹی کی چادر کے سوا کچھ نہ تھا اور اس میں چیلوں، گدھوں اور کوؤں کے جھنڈ اُڑا کرتے تھے۔ تو نے زمین کا یہ خطہ کن لوگوں کو بخشا ہے۔ یہاں کب کسی نے تجھے ایسے پوجا ہوگا جیسا میں اور میرے لوگ تجھے پوجتے آئے ہیں۔ یہاں کے سب لوگ بے عقیدہ، بے رنگ و بدشکل، پلید و گناہ گار لوگوں کو کتنی حسین اور زندگی سے بھرپور زمین عطا کی ہے۔ میں ساری عمر تیری بے انصافی کا رونا روتا رہا ہوں۔ گڈریے نے ہمدردی سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ اور اس کے ہاتھ پکڑ کے اُسے بٹھاتے ہوئے کہا۔ جو دیکھ رہے ہو۔ اسکی تحقیر نہ کرو۔ اپنے صدمے سے باہر نکلو۔ اور میرے ساتھ چلو تاکہ میں تمہارے اعزاز میں لذیذ غذاؤں کا دسترخوان سجا سکوں۔ وہ گڈریے کی بات کو نفرت سے ان سنی کرتے ہوئے نفرت سے بولا کیا تم اور تمہارے لوگ ہم سے زیادہ خدا پرست، پاک وصاف اور ایماندار ہیں۔ کیا تم اور تمہارے لوگ ہم سے زیادہ نیک اور راست باز ہیں کیا تم کبھی خدا کے لیے بھوک اور پیاس کی مصیبت میں مبتلا ہوئے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم لوگ کبھی بھی ہماری طرح خدا سے محبت نہیں کر پاؤں گے لیکن پھر بھی ہمارے خدا نے تمہیں وہ سب کچھ عطا کر دیا ہے جو ہم مرجانے کے بعد دیکھنے کی آس لیے جیتے رہتے ہیں۔ گڈریا آہستہ اور نرم لہجے میں بولا۔ میرے دوست یہ تو چراگاہ ہے۔ تمہاری خوشی اور نصیب کی زمین تو ان سبز پہاڑوں سے ذرا فاصلے پر ہے۔ تمہیں یہاں رہ کر سب کچھ ملے گا تم شاید ابھی تک اُسی نیند کے عالم میں ہو جو تمہارے وطن میں تم پہ طاری تھی۔ جاگو اور اس چراگاہ کی سیر کرتے ہوئے ان آبشاروں کی طرف جاؤ۔ جو ہمارے لوگوں نے اپنی زندگی بھر کی کمائیوں، مشقتوں اور قربانیوں سے سجا رکھے ہیں۔ وہ غصے اور حسد سے پھنکارتے ہوئے سجدے سے یوں اُٹھا کہ اس نے اپنی بغل میں چھپی ہوئی نیام سے ایک دو دھاری لمبا خنجر ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ یہ خنجر اتنے گہرے زہر میں بجھا ہوا ہے کہ اسکو ہلکا سا چھونے سے بھی تمہاری موت واقع ہو سکتی ہے۔ اور تمہاری طرح کے سینکڑوں آدمیوں کا گلہ کاٹنے کے بعد بھی اس کی دھار پہ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ گڈریا کچھ کہتا۔ اس نے خنجر کی نوک سے گڈریے کے اردگرد زمین میں دائرہ کھینچتے ہوئے خنجر کو گڈریے کے سامنے دائرے کے اندر زمین پہ گھونپتے ہوئے کہا۔ تم اگر اس دائرے سے باہر نکلو گے۔ تو خنجر اُچھل کر تمہارے سینے

میں دھنس جائے گا۔ تم اگر دائرے سے باہر نکلو تو منجر کی نحوست اور ہلاکت تم سے آن چمٹے۔ میں تمہاری کسی مدد اور تعاون کے بغیر اس وادی میں اپنے لیے جگہ ڈھونڈ کے آیا ہوں۔ میرے آنے تک تم اس خنجر کی نگرانی میں رہو گے۔

گڈریا اُس کی باتوں اور حرکتوں پہ مسکراتے ہوئے چپ کھڑا رہا۔ جبکہ وہ چیختا ہوا سبز پہاڑوں کے اُسی درے کی طرف بھاگا جہاں سے وہ وادی میں داخل ہوا تھا۔ گڈریا کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا۔ اور پھر اپنے بھیڑوں کو چرتا دیکھ کر دائرے میں بیٹھ گیا۔ پھر جیسے ہی گڈریے نے اپنے سفید بالوں والے رکھوالے کتے کو اپنی طرف تیزی سے بھاگتے ہوئے دیکھا تو گھبرا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ رکھوالا کتا اس کے ساتھ کچھ دیر اٹھکیلیاں کرے گا۔ اس نے فوراً زمین میں دھنسا ہوا خنجر اپنی قمیض کے اندر بائیں پہلو میں چھپالیا۔ اس کا رکھوالا کتا اُسے منہ میں لے کر بھاگ سکتا تھا۔ رکھوالے کی دوربین نگاہوں نے اُسے پہلو میں کچھ چھپاتے دیکھ لیا تھا۔ آتے ہی اس نے اچھل کر اس کے بغلوں میں منہ دے کر کچھ سونگھنے اور ٹٹولنے کی کوشش کی۔

لیکن گڈریا اُسے جُل دیتا رہا۔ اسی مستی اور چھیڑ چھاڑ میں گڈریے نے دائرے سے باہر چھلانگ لگا کر نیچے ڈھلوانوں میں بھیڑوں کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ لیکن رکھوالا کتا تیزی سے بھاگتے ہوئے بھی اسکی بغلوں میں چھپی ہوئی کسی انہونی چیز کو منہ میں لینے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر یکایک گڈریا زمین پہ جھک گیا۔ اس کے پیچھے دور تک جگہ جگہ خون کی بوندیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کا رکھوالا کتا اس کے بدن کو ڈھیلا اور سرد دیکھ کر جھینپ گیا پھر اس نے زمین پر منہ رکھتے ہوئے دور تک خون کی بوندوں کو سونگنا شروع کیا اور پھر واپس آکر کراہتا ہوا اپنے مالک کے منہ کو سونگھتا رہا۔ اور پھر ہلکے ہلکے بھونکتا رہا۔ گڈریا زمین پر کندھوں کے بل جھکے ہوئے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اور اسکے رکھوالے کتے نے اچھل اچھل کر اسکی حالت کو سمجھنے کی کوشش کی۔ بے چینی اور بے بسی میں رکھوالے کتے نے اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کیا۔ دور ندی کے کنارے رکھوالے کو ایک آدمی چلتا ہوا دکھائی دیا رکھوالے نے برق رفتاری سے اُسکی طرف دوڑنا شروع کیا۔ آدمی نے جیسے ایک برف جیسے سفید اور گھنے بالوں والے بڑے سے کتے کو تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا تو اس نے اپنی بغل میں نیام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نیام خالی پا کر اس نے زمین پہ پتھر ڈھونڈنا شروع کردیے۔ کتا تیزی سے اسکی طرف بڑھے جا رہا تھا۔ لیکن وہ غراتے اور بھونکنے کی بجائے کراہتا ہوا بڑھے آرہا تھا۔

اتنے خوفناک کتے کو اپنے قریب آتا دیکھ کر اس نے اپنی جان بچانے کے لیے دوڑنا شروع کردیا۔ لیکن دہشت کے باعث وہ راستہ بھول گیا۔ اسے کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے بہتی ہوئی صاف ندی میں چھلانگ لگادی۔ ندی کا پانی اس کی برداشت سے زیادہ سرد تھا۔ لیکن وہ کتے سے جان بچانے کے لیے ندی کے تہہ میں سانس روکے ڈبکا رہا۔ رکھوالا ندی کے کنارے سسکیاں لیتے دوڑتا رہا۔ نا اُمید ہو کر اس نے دوبارہ اپنے مالک کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ جو کمر کے بل زمین پہ لیٹ چکا تھا۔ اس کا منہ کھلا اور آنکھیں نیلے اور صاف آسمان پہ ٹکی ہوئی تھیں۔ رکھوالے نے دوبارہ اس کا منہ سونگھا اسے چاٹا اور پھر اس کے سینے پہ گردن رکھ کے کراہتے ہوئے بھونکنے لگا۔ اس نے کئی بار اچھل کر ندی کی طرف بھی دیکھا لیکن وہاں اسے کوئی آدمی نما مخلوق نظر نہ آئی۔

آصف ثاقب / بوئی ہزارہ

اشارے سا اشارہ کون دیکھے
مقدر کا ستارہ کون دیکھے
یہاں صورت کی مورت دیکھتے ہیں
مگر جگرا ہمارا کون دیکھے
سبھی مٹی میں گرتا دیکھتے ہیں
بہت اُونچا ہلارا کون دیکھے
ہمیں دو چار کلیاں دیکھنی ہیں
چمن سارے کا سارا کون دیکھے
بچپن جب تلخیوں کا سامنا ہے
سماں یہ پیارا پیارا کون دیکھے
ہمیں اپنی محبت کی پڑی ہے
تری اُفتاد یارا کون دیکھے
نظر اک بار کی کافی ہوئی ہے
ہمیں ثاقب دوبارہ کون دیکھے

لیاقت علی منہاس / میاں چنوں

مجھ کو سب سے جدا بنایا گیا
چاہتوں کی صدا بنایا گیا
جو شریک حیات ہے اس کا
میں مجازی خدا بنایا گیا
تو اگر غور کر تو بھید کھلے
علم کی ہے ضیاء بنایا گیا
خاص مجھ پر کرم ہے مالک کا
میرا جو مرتبہ بنایا گیا
مانگتا ہے کوئی دعاؤں میں
ٹوٹے دل کی دوا بنایا گیا
کیا لیاقت کروں غرور مجھے
پتلہ اک مٹی کا بنایا گیا

انجینئر ظفر محی الدین

وعدہ

دھوپ اپنے جوبن پر تھی۔ وہ دونوں چھت پر کھڑے تھے، خاموش، مگر ہوا میں کچھ تھا۔ شاید کوئی ان کہی بات، کوئی بے نام سا وعدہ۔

"تم لوٹ آؤ گے، نا؟" حیا کی آواز میں لرزش تھی۔

اذلان نے لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں دیکھا، جیسے وہاں سے کوئی تسلی کشید کرنا چاہتا ہو۔ پھر آہستہ سے مسکرادیا۔ "وعدہ کرتا ہوں۔"

وہ جانتی تھی، اذلان جو کہتا ہے، وہ کرتا ہے۔ مگر جنگ کے میدان میں وعدے تقدیر کے ہاتھوں ہار جایا کرتے ہیں۔

"اگر نہ لوٹے تو؟" اس نے دل گرفتہ ہو کر پوچھا۔

اذلان نے اس کی پیشانی پر انگلیوں کی پوروں سے ہلکی سی ضرب لگائی، جیسے کوئی نصیحت دے رہا ہو۔

"تو تم دعا کرنا۔ اللہ کی رضا میں اپنی رضا رکھنا۔"

حیا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر الفاظ حلق میں ہی کہیں پھنس گئے۔

دن، مہینے، سال بیت گئے۔ خبریں آئیں، جنگ ختم ہوئی، سپاہی واپس لوٹے، مگر اذلان کا نام ان میں نہیں تھا۔

حیا نے بہت دعائیں کیں، بہت صبر کیا۔ ہر اذان پر اس کا دل دھڑک اٹھتا کہ شاید اذلان لوٹ آیا ہو۔ مگر وہ نہ آیا۔

ایک دن دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

حیا نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک پرانا، دھندلا ہوا خاکی لفافہ رکھا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے اسے کھولا۔ اندر اذلان کی تحریر تھی:

"وعدہ نبھانے لوٹ آیا ہوں، مگر شاید تمہیں دکھائی نہ دوں۔ دعا قبول ہوگئی، حیا۔ اللہ کی رضا میں تمہاری رضا دیکھ لی۔"

حیا نے چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا۔ دھوپ آج بھی جوبن پر تھی، مگر اب وہ روشن نہیں، دھندلی لگ رہی تھی۔

روشنی کے سائے

عالیہ ایک مشہور فلمی اداکارہ تھی، لیکن اس کی چمکدار دنیا کے پیچھے اندھیرے کی ایک لمبی رات تھی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اس کی زندگی خوابوں جیسی ہے، مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔

ہر روز صبح جب وہ شیشے کے سامنے بیٹھتی، تو اس کے چہرے پر ایک نیا کردار سجایا جاتا۔ مگر اس کا اصل چہرہ، جس پر تھکن، تنہائی اور دکھ کے نشانات تھے، وہ میک اپ کے نیچے چھپ جاتا۔ روشنیوں کے بیچ، کیمروں کی چمک میں، مسکراہٹیں بکھیرنا اس کا فن تھا، مگر اندر کہیں وہ ٹوٹ رہی تھی۔

اس کا بچپن غربت میں گزرا تھا، اور فلمی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد بھی اسے عزت اور کامیابی کے لیے بے شمار سمجھوتے کرنے پڑے۔ ہر کردار کے ساتھ وہ اپنی اصل شناخت کھوتی گئی۔ دوستوں کے ہجوم میں بھی وہ تنہا تھی۔ شہرت تو ملی، مگر وہ محبت اور سکون کو ترستی رہی۔

ایک دن، جب وہ شوٹنگ کے بعد تنہا اپنے کمرے میں بیٹھی تھی، اس نے آئینے میں خود کو دیکھا، بغیر میک اپ، بغیر کسی نقاب کے۔ ایک تھکی ہوئی، اُداس عورت۔ اس لمحے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب اپنی خوشی کے لیے جیے گی، دوسروں کی توقعات کے بوجھ تلے نہیں۔

اگلی صبح اس نے اپنے منیجر کو فون کیا اور کچھ وقت کے لیے فلمی دنیا سے دور جانے کا اعلان کر دیا۔ روشنیوں کی دنیا سے کچھ فاصلے پر، شاید وہ اپنی کھوئی ہوئی شناخت دوبارہ پا سکے۔

ابن عاصی

اک کہانی بنتے ہوئے شہر کی کہانی

اسے وہ کٹا ہوا سر کورنگی کے پاکستان چوک کے قریب پڑے ہوئے ایک کوڑے کے ڈرم سے ملا تھا وہ کسی پکے سے رنگ والے ایک نوجوان لڑکے کا سر تھا اس میں سے خون ابھی تک بہہ رہا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اس سر کو کٹے ہوئے ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی اب وہ یہ سر اٹھا کر اردگرد موجود ساری آبادی سے پوچھ چکا تھا کہ یہ سر آپ کا تو نہیں؟ لیکن وہ جس دروازے پر بھی جاتا لوگ پہلے اسے اور پھر اس کے ہاتھ میں پکڑے سر کو دیکھ کے ایک لمبی سی چیخ مارتے اور جلدی سے دروازہ بند کر لیتے شام کا وقت ہو رہا تھا جب وہ ایک حجام کی دکان میں داخل ہوا سر اس کے داہنے ہاتھ میں ہی تھا وہاں جا کے بھی اس نے وہی سوال کیا جو کہ وہ صبح سے اردگرد کی ساری آبادی سے پوچھ چکا تھا،

یہ سر کس کا ہے؟ آپ کا تو نہیں؟

دکان میں موجود حجام اور اس کے گاہکوں نے پہلے اسے اور پھر اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سر کی طرف دیکھا اور چیخیں مارتے ہوئے وہاں سے دوڑ گئے وہ انھیں روکتا ہی رہ گیا لیکن کسی نے بھی اس کی نہ سنی منٹوں سیکنڈوں میں دکان خالی ہوگئی تھی اس نے ایک لمبا سا سانس لیا اور اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا، یہ لوگوں کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے میری بات کا جواب دینے کی بجائے چیخیں مارنے لگ جاتے ہیں کوئی دروازہ بند کر لیتا ہے اور کوئی دوڑ جاتا ہے،

پتہ نہیں یہ کس غریب کا سر ہے؟ صبح سے میں بھی خوار ہو رہا ہوں اور یہ بھی، اللہ جانے کب پتہ لگے گا کہ یہ کس کا سر ہے؟ یہ کہتا ہوا وہ دکان میں لگے آئینے میں اپنا منہ دیکھنے لگا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کے کندھوں پر سے اس کا سر غائب تھا۔

اک اور طرح کی چٹھی

اسلم کلرک کی چھوٹی بیٹی بھی گھر سے بھاگ گئی تھی گھر سے بھاگتے وقت اس نے اپنے باپ کے نام ایک چٹھی لکھی تھی، اس نے لکھا تھا

ابا جی! میں جانتی ہوں کہ آپ کو اپنی دوسری بیٹی کے بھی گھر سے بھاگنے کا اور بھی زیادہ دکھ ہوگا اور آپ مرنے والے ہو جائیں گے لیکن اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ آپ کے پاس ہمیں دینے کے لئے جہیز نہیں اور جہیز کے بغیر آج کل لڑکیوں کی ڈولیاں نہیں اٹھائی جاتیں اس بات کا آپ کو بھی پتہ ہے اور مجھے بھی، وہاں ہم جان بوجھ کر انجان بنے رہتے تو اور بات ہے اور جب جہیز نہیں تو پھر میری بھی شادی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے اپنی بڑی بہن سکینہ کی طرح میں بھی گھر سے جا رہی ہوں مجھے معاف کر دیجئے گا اور اپنی اپنی عزت کے جانے کا رونا ہرگز مت رونے گا

ابا جی! غریبوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی اگر ہوتی تو آپ کے گھر کوئی آپ کی بیٹیوں کا سوالی ان کے ضرور آتا۔۔۔ کوئی آیا؟ نہیں آیا ناں؟

ابا جی! جہیز نہیں تو عزت بھی نہیں اور وہ پہلے بھی گھر بیٹھنے سے بھی تو ہماری اور آپ کی بے عزتی ہو ہی رہی تھی کہ نہیں؟ لوگ آپ کو طعنے دیتے تھے کہ تمہاری بیٹیوں کے سر سفید ہو گئے ہیں ان کی شادیاں کیوں نہیں کرتے؟ آپ چپ چاپ سب کچھ سنتے رہتے تھے آپ میرے باپ ہیں لیکن اپنے ایمان سے بتائیں کہ کیا کسی عزت دار آدمی کو کوئی ایسے طعنے دینے کی جرات کر سکتا ہے؟ اور پھر آپ اپنی کس عزت شرت کے رونے روؤ گے؟ جو چیز ہے ہی نہیں اس کے لٹنے کا ماتم کیا کرنا؟ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔۔۔ کہ نہیں؟

اسلم کلرک نے اپنی چھوٹی بیٹی کی چٹھی پڑھ کے ایک لمبی سانس لی اور دونوں ہاتھ ٹکا کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور خود سے مخاطب ہو کر کہنے لگا

میری بچی! میں تمہیں کیا بتاؤں؟ میں تو اسی دن مر گیا تھا جس دن میرے گھر تمہاری بڑی بہن سکینہ پیدا ہوئی تھی اور ایک مرے ہوئے بندے کو تم عزت کے بارے میں بتا رہی ہو؟

چھ ارب انسانوں کے لئے

ایک چھوٹی سی کہانی

کسی جنگل میں چیونٹیاں ایک لمبی لائن میں جا رہی تھیں کہ اچانک سب سے پچھلی چیونٹی نے گردن آگے نکالی اور سب سے اگلی چیونٹی کو مخاطب کر کے کہنے لگی: ذرا دھیان سے۔۔۔۔ ہمیں کسی اندھے کنویں میں نہ پھینک دینا

سب سے اگلی چیونٹی تھوڑا سا مسکرائی اور پیچھے منہ کر کے بولی

تمہارے جیسی قوم پیچھے بوجھ کے لئے موجود ہو تو کوئی کنویں میں کیسے گر سکتا ہے؟

پھر آدم کا کیا ہوا؟

جب سمندر کے پانی نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو ہر طرف بھاگ دوڑ شروع ہو گئی سب جاندار اپنی اپنی جانیں بچانے کے لئے کوئی اونچی اور محفوظ جگہ ڈھونڈ رہے تھے کہ اچانک ایک اعلان ہونے لگ گیا کہ ہر جاندار میں سے ایک جوڑا فلاں پہاڑ پر موجود کشتی میں پہنچ جائے سب ادھر کو دوڑ پڑے اور کشتی دیکھتے ہی جلدی سے اس میں بیٹھ گئے کشتی چلنے لگی تو ایک عورت اور مرد بھی وہاں آن پہنچے دونوں کشتی میں بیٹھنے لگے تو کشتی والوں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ

اس میں کوئی انسان نہیں بیٹھ سکتا۔

مرد نے حیران ہو کر کہا

کیوں۔۔۔؟ حضرت نوح کی کشتی میں تو انسان بھی بیٹھے تھے؟

روکنے والے نے کہا

یہاں نہ کوئی نوح ہے اور نہ ہی یہ ان کی کشتی ہے اس لئے تم دونوں نہیں بیٹھ سکتے۔

اگر ہم انسان نہ بیٹھے تو انسانوں کی نسل آگے کیسے چلے گی۔۔۔؟ انسان تو پھر دنیا سے ختم ہو جائیں گے۔۔۔؟

دوسرا روکنے والا تھوڑا سا مسکرایا اور بولا

اسی لئے تو تمہیں کشتی میں بٹھایا نہیں جا رہا ہے۔

تقسیم

تینوں فریق مسجد کی ملکیت کا دعوی کر رہے تھے علاقے کے بڑوں نے بہت سمجھایا لیکن کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا جب بات کسی کنارے لگتی نظر نہ آئی تو بڑوں نے فیصلہ کیا کہ مسجد کے تین حصے کر دیئے جائیں مسجد کو تین ٹکڑیاں لگتی تھیں برابر برابر جگہ تینوں فریقوں کو دے کر درمیان میں دیواریں کھڑی کر کے دروازے لگا دیئے گئے اور پھر مسجد کے سامان کی تقسیم شروع ہو گئی

تو یوں قرآن پاکوں سپاروں صفوں رحلوں کے ساتھ ساتھ مردے نہلانے والے پھٹے اور میت لے جانے والی چارپائیاں تک بانٹ لی گئیں لوٹے تک آدھے آدھے کر لیے گئے

سب کچھ بانٹا جا چکا تو ایک سفید داڑھی والے بابے نے پوچھا۔۔

کچھ بانٹنے سے رہ تو نہیں گیا؟

رہ گیا ہے۔۔۔۔ ایک طرف سے آواز آئی

کیا۔۔؟ سب نے آواز والے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔۔ کیا رہ گیا ہے؟

رب۔۔۔! اس نے کہا! رب تقسیم ہونے سے رہ گیا ہے۔

اس کی یہ بات سن کے سب کو پتہ نہیں کیوں اک چپ سی لگ گئی تھی۔

بکنگھم پیلس

فقیر اللہ خاں/امریکا

جن ممالک میں بادشاہت ہو وہاں محل بھی ہوتے ہیں، ویسے بھی اس دور میں دنیا میں چند ممالک ہی رہ گئے ہیں اور وہ بھی اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، جہاں بادشاہت ابھی تک قائم ہے۔ بادشاہوں کو محل کے بغیر چین نصیب نہیں ہوتا، غریب اور گدڑی پوش لوگوں کے لیے ایک کٹیا بھی محل سے کم نہیں ہوتی لیکن بادشاہوں کے مقبرے بھی محل ہی ہوتے ہیں جیسے تاج محل۔

برطانیہ کا نظامِ سلطنت بھی بادشاہت ہی ہے جو کئی صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ آج کل برطانیہ کا بادشاہ چارلس سوم ہے جو لندن کے شاہی محل بکنگھم پیلس میں مقیم ہے۔ یہ محل لندن کے وسطی علاقہ میں پانچ منزلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں کل 775 کمرے ہیں۔ بکنگھم پیلس کے فرش کا رقبہ 830,000 مربع فٹ ہے۔ یہ محل سامنے سے 355 فٹ لمبائی 390 فٹ اور 80 فٹ اُونچا ہے۔ اس میں 52 کمرے شاہی خاندان کے لیے مخصوص ہیں، 188 سٹاف ملازمین کے لیے، 240 بیڈ روم، 92 کمرے دفاتر کے زیر استعمال ہیں، 19 سٹیٹ روم اور 78 باتھ روم ہیں۔ ایک بہت وسیع پکچر گیلری بھی اس محل میں موجود ہے۔ شاہی فیملی کے پرائیویٹ روز مز محل کے شمالی جانب واقع ہیں۔ بکنگھم پیلس کے اندر ہی پوسٹ آفس، سوئمنگ پول، سینما، ڈاکٹر روم، سرجری اور جیولری روم بھی موجود ہیں۔ مختلف سرکاری اور شاہی تقریبات کے لیے بھی الگ الگ کمرے اور بڑے ہالز ہیں۔ سب سے بڑا کمرہ ہال روم ہے جو 120 فٹ لمبا، 60 فٹ چوڑا اور 45 فٹ اونچا ہے، یہ کمرہ 1854ء میں تعمیر ہوا۔

محل کے عقب میں ایک بہت بڑا باغ ہے جس کے ایک طرف تین ایکڑ رقبہ پر پھیلی ہوئی جھیل ہے۔ ٹینس کورٹ بھی اسی باغ میں بنایا گیا ہے۔ ہیلی کوپٹر کے اُترنے کے لیے ہیلی پیڈ ہے۔ یہ لندن کا سب سے بڑا پرائیویٹ باغ ہے۔ شاہِ برطانیہ کی طرف سے ہر سال معزز مہمانوں کے لیے گارڈن پارٹیاں اور ضیافتیں اسی باغ میں دی جاتی ہیں۔ اس باغ کا رقبہ 40 ایکڑ ہے۔

بکنگھم پیلس 1703ء میں تعمیر کیا گیا۔ شاہ جارج سوم نے 1761ء میں اسے 21000 پاؤنڈ میں خریدا۔ ملکہ وکٹوریہ نے تخت نشینی کے وقت 1837ء میں اسے شاہی رہائش گاہ بنایا۔ پرنس البرٹ نے ملکہ وکٹوریہ سے 1840ء میں شادی کے بعد بکنگھم پیلس کو نئے انداز سے ترتیب دیا اور اس میں کچھ توسیع بھی کروائی۔ پرنس البرٹ کا 1861ء میں اور ملکہ وکٹوریہ کا 1901ء میں انتقال ہوا۔

جنگِ عظیم اوّل (1914ء-1918ء) کے دوران بکنگھم پیلس جنگی حملوں اور اُس کے اثرات سے بالکل محفوظ رہا۔ حالانکہ جنگ کے دوران شاہی فیملی اسی محل میں مقیم رہی لیکن جنگِ عظیم دوم (1939ء-1945ء) کے دوران نو دفعہ بکنگھم پیلس جرمن بمباری کی زد میں آیا۔ پیلس کو بہت نقصان پہنچا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد محل کی مرمت کر کے اس کی تزئین و آرائش بحال کر دی گئی۔

بکنگھم پیلس متحدہ برطانیہ کے شاہی خاندان کی ایک یادگار اور خوبصورت علامت ہے۔ دنیا کے سیاح اسے بڑے شوق سے دیکھنے آتے ہیں۔ ہر سال بادشاہِ وقت کی دعوت پر 50 ہزار مہمان مختلف ضیافتوں میں شرکت کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ موسم گرما میں تقریبات محل کے عقبی گارڈن میں منعقد ہوتی ہیں۔ بکنگھم پیلس کے سامنے مال روڈ پر گارڈز کی تبدیلی کا منظر بہت پرلطف اور قابل دید ہوتا ہے۔ جسے دیکھنے کے لیے لوگ گھنٹوں انتظار کرتے ہیں۔ گارڈز کی تبدیلی کی پریڈ گرمیوں میں اپریل سے جولائی تک ہر دوسرے دن باقاعدگی سے منعقد ہوتی ہے۔ یہ تقریب 45 منٹ تک رہتی ہے۔

برطانیہ کے شاہی حکمران کا ایک ذاتی جھنڈا ہوتا ہے جو بکنگھم پیلس کے اُوپر برطانیہ کے سرکاری جھنڈے کے ساتھ لہرایا جاتا ہے۔ یہ شاہی جھنڈا رائل سٹینڈرڈ کہلایا جاتا ہے۔ اگر بادشاہ بکنگھم کے اندر موجود نہیں ہے تو یہ رائل سٹینڈرڈ نہیں لہرایا جاتا بلکہ صرف سرکاری جھنڈا یونین جیک ہی لہرایا جاتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ بادشاہ محل کے اندر موجود ہے یا نہیں۔

- ⊙ بکنگم پیلس 10 ڈاؤننگ سٹریٹ، ہائیڈ پارک، پارلیمنٹ ہاؤس اور ویسٹ منسٹر ایبے کے پاس واقع ہے۔
- ⊙ بکنگھم پیلس میں 350 کلاک نصب ہیں، جن کی دیکھ بھال کے لیے ملازم موجود ہیں۔
- ⊙ محل میں 40 ہزار روشنی کے بلب لگے ہوئے ہیں۔

تیرا خیال اور ہے میرا خیال اور ہے
میرا ملال اور ہے تیرا ملال اور ہے
ہوں گے حسین اور بھی ماہِ جبین اور بھی
مانا حسیں ہے چاند بھی تیرا جمال اور ہے
تیرے خیال میں کبھی وہ رفعتیں نہیں آئیں گی
حد نظر کا صید تو میرا کمال اور ہے
حرص و ہوس کا تو غلام عشق نہیں ترا امام
تجھ کو نچائے مال و زر میری دھمال اور ہے
ماپ نہ میری ثروتیں میں فقیر کوئے عشق
میرا اثاثہ ہے جنوں مال و منالِ اور ہے
لالہ و گل تھے منتظر بادِ بہار آئے گی
تو نہیں بہار وہ بادِ شمال اور ہے
اب بھی اذاں ہے گونجتی صبح و مسا جہان میں
کہنے کو یہ بھی ہے اذاں رسمِ بلال اور ہے
مانتا ہوں کہ آگ کا فقط جلانا کام ہے
آتشِ عشق کا جلیل لیکن تال اور ہے

احمد جلیل/اوکاڑہ

بھری محفل میں یاری کا ذرا سا مان تو رکھتے
عداوت خود جھکاتی سر ہتم اتنی شان تو رکھتے
بنا پوچھے مکینوں سے بنایا ہے مکاں تم نے
جلاتا دل سے نفرت کو وہ آتشدان تو رکھتے
لٹائے جا رہے ہو تم جو پرکھوں کی امانت تھی
حقیقت اور فسانے کی ذرا پہچان تو رکھتے
دلِ بے خود کی بستی کے امیروں میں تو بیٹھے ہو
بٹھاتے جس کو آنکھوں پر وہ اک مہمان تو رکھتے
محبت کے علاقے میں محل اونچا بنا بیٹھے
نظارے کی مگر خاطر کوئی انسان تو رکھتے
بڑے مسرور بیٹھے ہیں بجی محفل میں یار اپنے
دلِ بسمل کی حالت کا کوئی پرسان تو رکھتے

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

لو کیا اعتبار پھر اک بار
رہگذر ، انتظار پھر اک بار
وہ ہی بازار پھر وہی گاہک
اور وہی کاروبار پھر اک بار
کچھ مقدر کی کار سازی اور
کچھ مرا اختیار پھر اک بار
میں گرا اور سنبھل گیا آخر
تو ہوا آشکار پھر اک بار
رزمِ ہستی کا آخری حصہ
اور وہ ریگزار پھر اک بار
ہو گئی زندگی اذیت کی
قید سے وا گزار پھر اک بار
تیرگی ، رات ، درد ، خاموشی
دیپ تنہا گزار پھر اک بار

شہزاد دیپ/جھنگ

ایئرپورٹ

آج مجھے لگتا ہے
کہ میں
اک مسافر نہیں ایک ایئرپورٹ ہوں
ہاں ہاں
صحیح سنا میں ایک ایئرپورٹ ہوں
جس نے آنے جانے والوں کے
بے حساب رنگ دیکھے
خواہشوں اور چاہتوں میں گھلے
ہزاروں
خواب دیکھے
آمد پہ کبھی خوشی
اور جاتے ہوؤں کے ملال دیکھے
ہاں میں اک ایئرپورٹ ہوں
بچھڑتی ہوئی خالی
آنکھوں میں
مستقبل کے خواب دیکھے
کبھی دمکتے ہوئے گلابی چہرے
کبھی
نم آنکھوں میں حسرت کے جال دیکھے
انتظار کی گھڑیوں میں مسلتے ہوئے ہاتھ
کبھی جانے والوں کے لیے
دعاؤں میں ہاتھ دیکھے
ہاں میں
ایک ایئرپورٹ ہوں
جو ایک ہی جگہ پہ ٹھہرا ہوں
کبھی قربتوں کی خوشی کبھی دوری کے وبال
دیکھے
موسموں کی الٹ پلٹ میں
کئی رویوں کے ساز دیکھے
کبھی خوشی میں پھینکی ہوئی
کلیاں
کبھی پاؤں میں پڑے گلاب دیکھے
پھر کہوں گا میں یک ایئرپورٹ ہوں

عنبر عباس زیدی/لاہور

ادبی تقریبات

✦ معروف شاعر و ادیب ، ماہر علوم عروض و نباتات پروفیسر جناب آصف ثاقب (سلطان آف بوئی) کے اعزاز میں بزم ادب گورنمنٹ کالج مظفر آباد کے زیر اہتمام ایک شاندار تقریب کا انعقاد ہوا۔ صدارت کے فرائض معروف اردو و گوجری شاعر جناب مخلص وجدانی نے ادا کئے۔۔

✦ کالج کے بہت سے طلبا و طالبات کے علاوہ بہت سے اہل علم و دانش نے صاحبِ تقریب کے فن و شخصیت پر نہایت پر مغز مقالے پیش کر کے خوب داد سمیٹی۔ کالج ھذا کے اساتذہ اور طلبا کی کثیر تعداد کے ساتھ ساتھ ایبٹ آباد، مانسہرہ اور دیگر علاقوں سے بھی شعرا و ادبا نے شرکت فرمائی۔ جن میں مایہ ناز ماہر تعلیم اور ممتاز ادبی شخصیت جناب واحد سراج، جناب احمد حسین مجاہد، (پرائڈ آف پرفارمنس) جناب امتیاز الحق امتیاز ، ڈاکٹر جناب ضیاء الرشید ، جناب تاج الدین تاج جناب احمد ریاض، اور راقم الحروف مع برادر خورد غلام مصطفی اعوان شریک محفل تھے۔ مقامی شعرا اور صاحبان علم کی کثیر تعداد بھی اس محفل میں موجود تھی۔۔ جن میں محترم احمد عطا اللہ صاحب، جناب محمد یامین اور دیگر احباب شامل ہیں۔۔ معروف شاعر و ادیب پروفیسر جناب اعجاز نعمانی کی کوشش اور ادبی پرداخت کی کاوشوں پر بہت بہت داد و تحسین۔

✦ بزم علم و فن پاکستان (ہزارہ شاخ) کے زیر اہتمام پروفیسر ناصر داود ملک کے ناول، سنگلاں کی تقریب رونمائی ماڈرن ایج پبلک سکول و کالج کے گرلز کیمپس میں معروف اسکالر پروفیسر سردار محمد فاروق صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔

✦ پروفیسر ممتاز حیدر صاحب مہمان اعزاز اور نقیب محفل ڈاکٹر عامر سہیل تھے۔

✦ سہیل احمد صمیم اور ڈاکٹر عادل سعید قریشی نے کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے بہت عمدہ مقالے پیش کر کے کتاب کی اہمیت کو اجاگر کیا۔۔

✦ ڈاکٹر عامر سہیل اور سید ماجد شاہ نے کتاب پر بہت عمدہ اور بلند درجہ علمی گفتگو کر کے کتاب کی ادبی اور معاشرتی اہمیت کا احاطہ کیا۔۔ پروفیسر ممتاز حیدر صاحب نے صاحب کتاب سے اپنی پرانی رفاقت اور ان کے پیشہ ورانہ اور ادبی کاموں پر روشنی ڈالی۔۔

✦ بزم کے صدر، مایہ ناز ماہر تعلیم اور معروف شاعر و ادیب اور میزبان تقریب جناب واحد سراج نے تمام حاضرین محفل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ناول کی صنف پر فاضلانہ خطاب فرمایا اور اس کتاب کو ناولٹ کے قریب گردانا اور پروفیسر ناصر داود ملک کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی۔

ملک ناصر داود نے اپنے خطاب میں کتاب مذکورہ کے مندرجات کی تفصیل بتاتے ہوئے بزم علم فن کی علمی پرداخت کی کاوشوں پر مبارک باد پیش کی اور اس تقریب کے انعقاد پر شکریہ ادا کیا۔

صدر محفل پروفیسر سردار محمد فاروق نے ملک ناصر داود سے اپنی ہم جماعت اور ہم پیشہ دوستی اور محبت کے جذبات کا تفصیلی تذکرہ کیا اور محفل کو کشت زعفران بنا دیا۔۔

یہ خوبصورت ادبی تقریب حاضرین کے پر تکلف تواضع پر اختتام پذیر ہوئی۔۔

رپورٹ: عبدالوحید بسمل

بزم اہل قلم پاکستان راولپنڈی کے زیر اہتمام ایک محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی جس کی صدارت نامور شاعر حسن عباس رضا نے کی۔۔۔۔۔ مظفر گڑھ سے قومی سیرت ایوارڈ یافتہ مصنف ارشاد العصر جعفری اور راقم الحروف مہمانان خصوصی جب کہ ممتاز شاعر نسیم سحر مہمانِ اعزاز تھے۔ منعقدہ محفل کا اہتمام شاعر اور دانشور ڈاکٹر فرحت عباس نے کیا تھا۔

✦ بزم چغتائی کا ماہانہ مشاعرہ بابت ماہ فروری آج صبح ، لاہور گیریژن گرامر سکول (کڈز کیمپس) رضوان بلاک، اعوان ٹاؤن، لاہور میں منعقد ہوا جس کی صدارت ملک پاکستان کے نامور سینئر شاعر جناب شہزاد نیئر نے کی جبکہ مہمانانِ خصوصی میں جناب رمزی آثم (کراچی)، جناب حماد نیازی، جناب عمار اقبال، جناب نعیم رضا بھٹی (منڈی بہاؤ الدین)، جناب راول حسین اور جناب امجد مرید حیدری (گجرات) شامل تھے۔ مشاعرہ کی نظامت ہمیشہ کی طرح محمد افضل ساجد کے ذمہ رہی جسے انہوں نے بہت عمدگی سے نبھایا۔ نعتِ رسولِ مقبول پڑھنے کی سعادت جناب اسامہ عباس (فرزند محمد عباس مرزا) نے حاصل کی۔ شعرائے کرام میں محمد افضل ساجد، وسیم عباس، بشارت زائر ، محمد اویس ، عدنان ناظم (بھلوال ، سرگودھا) ، طیب حسن طیب (بھلوال ، سرگودھا) ، منان سرمد، اسلم شوق، شرجیل اعزاز، وسیم سدوی، ناصر ادیب ، باصر زیدی، محمد یاسین خاکی ، طارق شہاب ، ابوذر سعید (میلسی) ، رانا اسد ، اعجاز قریشی ، منیر جعفری، طاہر محمود ہاشمی ، سید ضیاء حسین، شوکت علی ناز، زاید جرپالوی ، نعیم عباس ساجد ، راؤ ندیم احسان ، پروفیسر فرخ محمود، علی قسور خلیق، اظہر عباس، ممتاز راشد لاہوری، محمد علی صابری اور محمد عباس مرزا شامل تھے۔

تین شعبان ظہورِ پرنور امام حسین علیہ السلام کی مناسبت سے احباب نے منقبت و سلام کے ذریعے امام عالی مقام کو خراج عقیدت پیش کیا اور دورانِ مشاعرہ احباب کے لئے مٹھائی کا اہتمام بھی کیا گیا۔ بلاشبہ یہ مشاعرہ بزمِ چغتائی کی تاریخ کا سب سے کامیاب اور بڑا مشاعرہ تھا، تمام ہی احباب نے خوب کلام پڑھا، نوجوانوں نے بھی اپنا رنگ خوبصورتی سے جمایا اور تر و تازہ اشعار سنائے، ہمیں ایک سے ایک اچھا شعر سننے کو ملا، بلاشبہ آپ سب احباب کی آمد سے یہ محفل شاندار رہی۔ صدرِ مجلس جناب شہزاد نیئر بہت متحرک صدر ثابت ہوئے اور ہر اچھے شعر پر خوب داد بھی دیتے رہے، ان کی صدارت بہت بابرکت رہی، مشاعرہ کے اختتام پر احباب کی تواضع کا بھی اہتمام کیا گیا۔

CamScanner

ادبی وثقافتی تنظیم ”زاویہ“ کے زیر اہتمام کراچی سے تشریف لائی شگون ”کانچ کا چراغ“ تیسرا قدم اور اب تازہ مجموعے ”بے موسی خواہشیں“ ایسے شاندار شعری مجموعوں کی خالق اور عزیز دوست ناصرہ زبیری کے اعزاز میں ایک خصوصی اور شاندار شعری محفل اکادمی ادبیات پاکستان کے کمیٹی روم میں منعقد ہوئی۔ صدارت اردو کے ممتاز شاعر اور دانشور جناب جلیل عالی نے فرمائی۔ مہمانِ خصوصی محترمہ ناصرہ زبیری اور محترمہ زبیرا حسن تھیں۔ اسلام آباد کے خوب صورت برستے موسم اور راستوں کی بندش کے باوجود بہت پیارے شعرا دوستوں نے بہت کم وقت کے باوصف اسے یادگار بنا دیا۔ ناصرہ زبیری صاحبہ کو بہت انہماک اور محبت سے سنا گیا۔ جو دوست تشریف لائے اور کلام سنایا ان میں جناب جلیل عالی، محترمہ ناصرہ زبیری، محترمہ زبیرا حسن، جناب حسن عباس رضا، جناب راحت سرحدی، جناب انجم سلیمی، جناب شاہد زمان، جناب افضل خان، جناب اختر رضا سلیمی، ڈاکٹر مہناز انجم، جناب حامد ظہور، جناب عقیل شاہ، ڈاکٹر بی بی امینہ، جناب الطاف شاہ، محترمہ فوزیہ وسیر، جناب اللہ راضی راجپوت، جناب فیصل شہزاد، جناب مزمل عارض، محترمہ منزہ جاوید، محترمہ طاہرہ غزل اور محبوب ظفر شامل تھے۔

✦ ادبی وثقافتی تنظیم ”زاویہ“ کے زیر اہتمام ادارہ فروغ قومی زبان کے تعاون سے آسٹریلیا میں مقیم ممتاز ترقی پسند ادیب، ناول نگار، شاعر اور دانشور جناب اشرف شاد کی کتاب ”صحافت کے خار وگل“ کی نہایت شاندار اور بھرپور تقریب جس میں جڑواں شہروں کے ممتاز اہل قلم کے علاوہ صحافی دوستوں اور باذوق سامعین کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت ممتاز اور سینئر صحافی جناب ناصر زیدی نے کی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر مہمانِ خصوصی تھے اور جناب مجاہد بریلوی، ڈاکٹر ناظر محمود، جناب حارث خلیق اور ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے کتاب کے حوالے سے نہایت عمدہ مضامین پڑھے اور جناب اشرف شاد کی طویل صحافتی وادبی خدمات اور کاوشوں کی تحسین کی۔ جناب اشرف شاد نے اس قدر کم وقت میں ایسی بھرپور تقریب کے لیے زاویہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تفصیل سے صحافت اور ادیب کی ذمہ داریوں کا گزشتنی اور موجودہ حالات کی روشنی میں ذکر کیا۔ دارالخلافہ میں ہونے والی یہ یادگار تقریب بہت دیر تک احباب کو یاد رہے گی۔

✦ اتوار۔۔ 23 فروری کو پاک ٹی ہاؤس میں ہونے والے مباحثہ کے پینل میں ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر امجد طفیل، ڈاکٹر صائمہ ارم، شہزاد نیر اور ڈاکٹر احتشام علی شامل تھے۔۔ میاں شہزاد نے ماڈریٹر کے فرائض سرانجام دیئے۔ تنقید کے مختلف مباحث اس مکالماتی نشست میں ہونے والی گفتگو کا حصہ رہے۔ پرمغز گفتگو ہوئی۔ پینل میں شامل شخصیات نے شرکاءِ اجلاس کے سوالات کے جواب بھی دیئے۔۔۔ آخر میں کراچی سے تشریف لائی مہمان شاعرہ محترمہ کشور عروج سے ان کا کلام سنا گیا۔۔

اجلاس کے اختتام سے پہلے حلقہ کے نئے انتظامی برس کے الیکشن کے حوالے سے الیکشن کمشنر محترمہ فرح رضوی نے اعلان کیا کہ سیکریٹری کی واحد امیدوار محترمہ شازیہ مفتی اور جوائنٹ سیکریٹری کے واحد امیدوار محترم سلمان رسول اشرف کے کاغذات نامزدگی پر مقررہ وقت تک کوئی اعتراض موصول نہیں ہوا، لہذا یہ دونوں شخصیات بلا مقابلہ منتخب قرار پائیں۔ شرکاءِ اجلاس نے حلقہ کے نومنتخب عہدیداران کو مبارک باد دی اور پھول پیش کئے۔۔۔ اس موقع پر نومنتخب سیکریٹری اور جوائنٹ سیکریٹری نے اپنی مختصر تقاریر میں حلقہ کے ممبران کا شکریہ ادا کیا اور حلقہ اربابِ ذوق کی شاندار روایات کو آگے بڑھانے کے عزم کا اظہار کیا۔۔۔

اجلاس کے 100 سے زائد شرکاء میں غلام حسین ساجد، شازیہ مفتی، ڈاکٹر کنول فیروز، واجد امیر، ڈاکٹر سہیل ممتاز، ناصر علی، توقیر عباس، سلمان رسول اشرف، انجم شیرازی، رشی خان، ڈاکٹر شاہد اشرف، ڈاکٹر صغیر احمد صغیر، آزاد مہدی، ابوالحسن خاور، صبا ممتاز بانو، فرح رضوی، طارق کامران، عبدالوحید، ثمینہ سید، راشد طفیل، اسلم شوق، رقیہ اکبر چوہدری، منزہ سحر، نائلہ عابد، شہزاد فراموش، زاہد ہما شاہ، شہزاد تابش علی عثمان باجوہ، میم سین بٹ، ریاض حسین، امتیاز انجم، شاہ میر مغل، عبدالبر بسمل، محمد جمیل، نوید نواز، نواب برکات محمود، فرحت، ایم افضل، اعجاز فکرال، اقبال بخاری، خاور شاہ، جہانگیر سندھو، جاوید حسین صدیقی (کراچی)، خالد محمود آشفتہ، جشن عباس، مائرہ منظور، حمزہ افتخار، محمد احمد، سجاد علی بھنڈر، ماہم وحید، حفصہ الٰہی اور دوسرے شامل تھے۔۔۔

بہ یاد: سید قاسم محمود
ماہنامہ بک ڈائجسٹ لاہور پاکستان
Book Digest
ISSN 2079-4584
مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر: اظہر سلیم مجوکہ
صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کیلئے منظور شدہ
براہ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری، نثر) ”ان پیج“ فارمیٹ میں ای میل کریں
مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کیے جا سکتے ہیں
رسالے کے حصول کے لئے
سالانہ زرتعاون مبلغ -/2500 روپے
اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ درج ذیل
جاز کیش، یو پیسہ اکاؤنٹ میں جمع کرایا جاسکتا ہے
0321-4377794
paisa 0333-4377794
Mazhar Saleem Majoka
برائے خط کتابت
ترسیل زر/رابطہ
کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
042-37322996
0333-4377794
bookdigest@hotmail.com,kitabvirsa@gmail.com

شہر میں گاؤں کے پرندے (ایک تجزیاتی مطالعہ)

روداد: ڈاکٹر ساجد علی

ممتاز نظم نگار ڈاکٹر وحید احمد کی صدارت میں حلقہ اربابِ ذوق راولپنڈی کے زیر اہتمام ڈاکٹر اسحاق وردگ کے شعری مجموعے کی تقریب پذیرائی تقریب میں ممتاز شعرا و ناقدین ڈاکٹر وحید احمد، عبید بازغ امر، رحمان حفیظ، منیر فیاض کی کتاب پر گفتگو، ممتاز افسانہ نگار پروفیسر خالد سہیل ملک نے اسحاقِ وردگ کا خاکہ پڑھا

''شہر میں گاؤں کے پرندے'' اردو غزلیات کا وہ رجحان ساز مجموعہ ہے۔ جو 2021 میں شائع ہوا اور اس کی پذیرائی کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس کتاب نے خیبر پختونخوا کی اردو شاعری کی روایت کو نیا موڑ دیا۔ بلاشبہ اسے ایک رجحان ساز شعری مجموعے کا درجہ حاصل ہے۔ جدید اردو غزل کے صاحب اسلوب شاعر جناب ظفر اقبال (جن کے کالم میں اسحاق وردگ کی لگ بھگ 50 غزلیں بطورِ انتخاب چھپ چکی ہیں) ''شہر میں گاؤں کے پرندے'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

وہ (اسحاق وردگ) نئی شاعری کے باطن و ظاہر سے باخبر، نئے مضامین کا متلاشی اور اپ ٹو ڈیٹ شاعر ہے۔ اسحاق وردگ کا پیرایہء اظہار کہہ رہا ہے کہ وہ شاعروں کے ہجوم میں دوسروں سے منفرد نظر آنے کی راہ پر گامزن ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اسحاق وردگ کے روپ میں خیبر پختونخوا کی اردو شاعری نئی کروٹ لے چکی ہے۔ جس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ اکیسویں صدی میں خیبر پختونخوا کی اردو شاعری کی نئی لفظیات، اسلوب اور موضوعاتی تنوع کی تشکیل میں اسحاق وردگ صاحب طرز شاعر کے طور پر تاریخ ادب کا حصہ بن چکے ہیں۔

اردو ادبی دنیا کی معروف انجمن حلقہ اربابِ ذوق راولپنڈی نے گزشتہ دنوں راولپنڈی آرٹس کونسل میں ''شہر میں گاؤں کے پرندے ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے تقریب کا انعقاد کیا۔ جدید نظم کے صاحب اسلوب شاعر اور ناول نگار ڈاکٹر وحید احمد نے تقریب کی صدارت کی۔ تقریب میں اردو ادب کی نامور ادبی شخصیات ڈاکٹر وحید احمد، عبید بازغ امر، رحمان حفیظ اور منیر فیاض نے ''شہر میں گاؤں کے پرندے'' کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ممتاز افسانہ نگار، خاکہ نگار پروفیسر خالد سہیل ملک نے اسحاق وردگ کا خاکہ ''کھیلن کو مانگے چاند'' پڑھا۔ جسے خوب سراہا گیا۔

سیکرٹری حلقہ اربابِ ذوق راولپنڈی اور نوجوان شاعر نثار محمود تاثیر نے حاضرین محفل کو خوش آمدید کہا۔

جدید اردو نظم کے صاحب اسلوب شاعر ڈاکٹر وحید احمد نے تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کامیاب تقریب پر حلقہ اربابِ ذوق راولپنڈی کو مبارک باد دی اور کہا کہ آج کتاب پر عمدہ گفتگو ہوئی۔ انھوں نے ''شہر میں گاؤں کے پرندے'' کو روح عصر کا نمائندہ شعری مجموعہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ اسحاق وردگ کے اشعار ضرب المثل کا درجہ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ان کی شاعری نے خیبر پختونخوا کی شعری روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ وہ ایک حساس شاعر ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ بارہا مشاعرے پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ ان کی کتاب ''شہر میں گاؤں کے پرندے'' میں آج کل کے مسائل کو بڑی خوبصورت طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید احمد نے کتاب ماضی کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا کہ خیبر پختونخوا کے ساتھ میری محبت کا عجیب و غریب سلسلہ ہے۔ مجھے دوران ملازمت خیبر پختونخوا کو برسوں تک دیکھنے کا موقع ملا ہے اور پشاور کے اچھے زمانے اور برے زمانے دونوں دیکھنا نصیب ہوا۔ اس کتاب میں تاریخ دان کی طرح شہر آشوب کی کیفیات ہیں۔ ڈاکٹر وحید احمد نے کتاب سے یہ اشعار پڑھے۔

دروازے کو اوقات میں لانے کے لیے میں
دیوار کے اندر سے کئی بار گیا ہوں
چاک پر بے بسی بناتا ہوں
یعنی میں زندگی بناتا ہوں
پہلے تو شہر کے سب خواب جلائے اس نے
اور پھر راکھ کو تعبیر کا عنوان دیا
اپنی تجدید کر رہا تھا میں
گاؤں سے شہر آ گیا تھا میں

ڈاکٹر وحید احمد نے کہا کہ یہ موجودہ صورت حال کے بارے میں شاعر کا ردعمل ہے۔ ان کے اشعار میں ہمیں روشنی کی کرن بھی نظر آتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسحاق وردگ جیسا شاعر پشاور کے ادبی منظر نامے پہ موجود ہے تو خیبر پختونخوا میں اردو ادب کا مستقبل نہایت روشن ہے۔

معروف شاعر، محقق اور نقاد عبید بازغ امر نے اپنے تنقیدی تصورات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہا اسحاق وردگ کی شعری مثلث کے تین نقطے ہیں۔ جو جدا جدا ہونے کے باوجود ایک ہی وحدت کو تخلیق کرتے ہیں۔ یہاں شاعر خود بھی ایک پرندے کی مثال ہے۔ جو اپنی قوت پرواز یا زورِ تخیل سے روایت کے دائرے میں گھومتی ہوئی تنگنائے غزل کو وسعت آشنا کرتا ہے۔ اور اسے نئی جمالیات کا لمس دے کر کلیشے کی قید سے آزاد کرنے کی سعی کرتا ہے۔ انھوں نے کتاب سے اشعار کے حوالے دیتے ہوئے کہا اسحاق وردگ کی شاعری نئی جمالیات کی عکاس ہے۔ یہ رطبی و یابسی عناصر سے آلودہ نہیں۔ نہ ہی جدت محض کا کوئی چونکا دینے والا نمونہ ہے بلکہ یہ اس کے تخلیقی ذہن کا آمیختہ ہے جس میں اکیسویں صدی کے اصلی مسائل کے ساتھ ساتھ روایت کا گہرا شعور

بھی جھلکتا ہے۔ڈاکٹر وردگ نے فکری اور فنی سطح پر رسمی اظہار سے گریز کے رویے نے ان کے طیف شعر میں ایک خاص نوع کی چکاچوند پیدا کی ہے۔جس کی بدولت وہ اردو غزل میں اپنا منفرد لب و لہجہ اور شناخت قائم کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کے ہاں رسمی ڈگر سے ہٹ کر اشیاء کو نت نئے انداز میں پہلو بدل بدل کر دیکھنے کا رویہ بھی قابل ذکر ہے۔

معروف شاعر و نقاد منیر فیاض نے پاکستانی غزل کی روایت کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ پاکستانی غزل تقسیم کے بعد اپنا الگ رنگ و روپ بنا چکی ہے۔منیر فیاض نے دبستان پشاور کی غزلیہ روایت پر بھی طائرانہ نظر ڈالی اور کہا کہ اسحاق وردگ نے نئے رنگ میں احمد فراز اور غلام محمد قاصر کی روایت اکیسویں صدی میں زندہ رکھی ہوئی ہے۔وہ جدید شاعری کے اہم شاعر ہیں۔اسحاق وردگ کی شاعری میں امیج کا ٹریٹمنٹ نیا ہے۔معاصر صورت حال کے ساتھ ان کی غزل براہ راست جڑی ہوئی ہے۔ان سے آج میری پہلی ملاقات ہے۔تاہم ان کا نام دیکھتے ہی ہمارے ذہن میں خاص مزاج اور نئے ڈکشن کی غزل آجاتی ہے۔ان کے ہاں ماحولیاتی مضامین بھی ہیں۔انھوں نے شاعری میں اپنی مٹی اور معاصر صورت حال سے مکالمہ قائم کیا ہے۔اسحاق وردگ کا مجموعہ بھرپور تاثر کے ساتھ سامنے آیا ہے۔"شہر میں گاؤں کے پرندے" میں تین چار اسالیب کی موجودگی نظر آتی ہے۔اسحاق وردگ کے پاس اسالیب کا تنوع ہے اور ہر اسلوب میں یہ اچھا مصرع کہنے کا قرینہ رکھتے ہیں۔ان کی ایک ایک غزل میں الگ مزاج ملتا ہے۔انھوں نے شاعری میں اپنی دنیا تخلیق کی ہے۔جس میں جدید حسیات خصوصاً سماجی و سیاسی شعور،فطرت کا نوحہ،مزاحمتی رویے خوب صورتی سے آئے ہیں۔اسحاق وردگ امیج کے ذریعے شعر کہنے کا ہنر رکھتے ہیں ظفر اقبال،شکیب جلالی کی طرح ان کے ہاں بھی سسٹم آف امیجز ہے۔منیر فیاض نے امید ظاہر کی کہ اسحاق وردگ اپنی نئی کتاب میں مزید انہاک سے شعری مہارت کا اظہار کریں گے۔

ممتاز شاعر و نقاد رحمان حفیظ نے خیبر پختونخوا کے موجودہ شعری منظرنامے کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ دو ہزار کے بعد سامنے آنے والے شعرا میں اسحاق وردگ خیبر پختونخوا کی غزل کا نشان بن چکے ہیں۔احمد فراز،خاطر غزنوی،محسن احسان اور غلام محمد قاصر کی موجودگی سے خیبر پختونخوا ایک زمانے میں شاعری کا بڑا مرکز تھا۔آج بھی ڈیرہ اور ہزارہ میں اچھی غزل کہی جا رہی ہے۔اسحاق وردگ کا رنگ غزل سب سے مختلف ہے۔ان کی شاعری پر نہ تو خیبر پختونخوا کے سینئر شعرا کا اثر ہے اور نہ ہی ان کے معاصرین شعرا کا۔انھوں نے شاعری میں منفرد راستہ نکالا ہے۔انھوں نے یہ طے کر کے کہ شاعری کی کہ کلاسیکی نوع کی شاعری نہیں کرنی۔اسحاق وردگ کا رنگ تھوڑا سا الگ ہے۔ان کے ہاں رومانوی جذبات سطحیت سے پاک ہیں۔اسحاق وردگ نے جدید حسیات خصوصاً ماحولیاتی تناظر،اپنے عہد کے معاملات،ساجیات اور معاشیات کی عکاسی کامیابی کے ساتھ کی ہے۔جب جب "شہر میں گاؤں کے پرندے" پڑھی تو نئے نکات سامنے آئے ہیں۔اس کتاب میں پشاور کی سماجی،تہذیبی،سیاسی،اور خصوصاً پشاور میں دہشت گردی کے اثرات پر اچھے اشعار ملتے ہیں۔اسحاق وردگ نے روایت کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد روایت سے بغاوت کی ہے۔وہ سلجھا ہوا مصرع کہتے ہیں۔ان کی شاعری کا قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ ان کے ہاں جذباتیت نہیں ہے۔وہ بہت ہی سلیقے اور بڑی ذمہ داری کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔انھوں نے آج کے سماج اور زندگی کی پیچیدگیوں سے راہ فرار اختیار نہیں کی۔بلکہ جدید عہد کے تناظر میں معنی آفرینی پر مبنی شاعری کی ہے۔اسحاق وردگ کے کئی اشعار گردش اور سفر میں رہتے ہیں۔رحمان حفیظ نے اسحاق وردگ کے کئی نمائندہ اشعار پڑھے اور کہا اسحاق وردگ اپنی شاعری کی انفرادیت کے باعث الگ لہجہ اختیار کر چکے ہیں۔

ممتاز افسانہ نگار پروفیسر خالد سہیل ملک نے "اسحاق وردگ کے شخصی رویوں اور زندگی کی ترجیحات پر مبنی خاکہ "اسحاق وردگ ---کھیلن کو مانگے چاند" پڑھا۔انھوں نے تخلیقی انداز سے خاکے میں اسحاق وردگ کی شخصیت اور ادبی سفر کے بارے میں بتایا کہ اسحاق وردگ نے پشاور پر قناعت نہیں کی۔اس نے شاعری کو اسلوب حیات بنایا۔اسے پشاور میں روکنے والے دیکھتے رہ گئے۔اور اس نے پہلے اٹک پار اور پھر سرحد پار اپنی شاعری کا سکہ جمایا۔اسحاق کا شعر تو خود اپنی داد وصول کرتا ہے۔کوئی بھی شاعر کسی ایک شہر،کسی ایک حلقے تک تو ستائش باہمی کی بنیاد پر خود کو اچھا شاعر کہلوا سکتا ہے لیکن شعر اسی وقت سرحدوں کو عبور کرتا ہے جب اس شعر کے رنگ بھی نکھرے ہوں اور اس کی خوشبو بھی مہکتی ہو۔ورنہ تو"ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا" والی صورتحال ہی رہتی ہے۔اسحاق وردگ نے اس زمانے میں حلقہ چلایا بلکہ اس کا احیا کیا۔جب بم دھماکوں کی وجہ سے لوگوں نے پشاور شہر میں گھومنا پھرنا ہی بند کر دیا تھا۔لیکن اسحاق سر ہتھیلی پر رکھ کر حلقے کے اجلاس چلاتا رہا۔یوں اسحاق کے لیے سارا ادب شاید حلقہ ارباب ذوق میں سمٹ آیا تھا۔

تقریب کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر اسحاق وردگ نے اپنا تازہ کلام پڑھا اور عزت افزائی پر صدر محفل ڈاکٹر وحید احمد،رحمان حفیظ،عبید بازغ امر،منیر فیاض،خالد سہیل ملک،ممتاز شاعر افضل خان،حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کے سیکرٹری نثار محمود تاثیر اور تمام شرکائے محفل کا شکریہ ادا کیا۔

❀❀❀

نامہ ہائے احباب

جنوری 2025ء کا ارژنگ ملا۔ اپنی غزل دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی۔ اطمینان بھی ہوا کہ ''ارژنگ'' سے رشتہ قائم دائم ہے۔ آپ جانتے ہیں ارژنگ کا بہت پرانا لکھنے والا ہوں۔ جب ''ارژنگ'' اخبار تھا اس وقت میرا کلام اور مضمون اس میں شائع ہوتے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید نے اس میں مجھ پہ مقالہ بھی لکھا تھا۔ ارژنگ منہ موڑ لے تو ہم کدھر جائیں۔ غزل کی اشاعت میرے لیے خوش آئندہ ہے۔ رسالے کی ''ٹیپ ٹاپ'' بدستور ہے۔ رسالہ ہاتھ میں لو تو ایسے لگے کہ چاند ہتھیلی پر اُتر آیا۔ عبدالوحید بسمل صاحب کی لکھائیاں ''برائیوں'' سے پاک ہیں۔ ارژنگ میں ان کا ''ہونا'' پکا ہو گیا ہے۔ بسمل صاحب ایبٹ آباد کے ادب میں خاصے فعال ہیں۔ انٹرویو بدستور رہے۔ آپ کے ہاں انٹرویو کا مخصوص نظام ہے۔ آپ کی ادارت بھی ''عجیب وغریب'' اور شاعری بھی بھرپور۔ میری دعا ہے کہ خدا ارژنگ کو اسی طرح ہنستا پھولتا رکھے۔ آمین

خیراندیش

آصف ثاقب

جناب عامر بن علی!

سلام مسنون۔ ماہنامہ ''ارژنگ'' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ ماشاءاللہ بہت اہم تخلیقات اور سب سے دلچسپ انٹرویو ہیں جن کی ادبی دنیا میں بڑی دھوم مچی ہوئی ہے۔ آپ کے ساتھ جاپان میں گزرے یا گزارے ہوئے دن اور راتیں بہت یاد آتی ہیں۔

ارادہ باندھتا ہوں کہ آپ کو تازہ غزل یا نظم بھیجوں بات درمیان میں رہ ہی جاتی ہے۔

اپنا تازہ ترین منفرد مجموعہ کلام ''رقص یعنی'' برائے تبصرہ ارسال خدمت ہے۔

دیکھئے جب بھی مناسب ہو اس پر تبصرہ کروا دیجیے گا۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

محمود شام

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں آپ کے موقر ادبی رسالے ''ارژنگ'' کا ایک مستقل قاری ہوں اور اس کی ادبی و تخلیقی جہات کا دل سے معترف ہوں۔ آپ کی ادارت میں یہ رسالہ ادب کے تمام اہم گوشوں کا احاطہ کر رہا ہے اور اردو زبان و ادب کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔

سب سے پہلے، میں ''ارژنگ'' میں شائع ہونے والے مضامین کی تعریف کرنا چاہوں گا، جو نہ صرف علمی و فکری سطح پر بلند ہوتے ہیں بلکہ قاری کے لیے نئے زاویے بھی کھولتے ہیں۔ ان میں موجود تحقیق و تجزیہ، موضوع کی گہرائی اور اسلوب کی شائستگی ہمیشہ متاثر کن ہوتی ہے۔

افسانے بھی اس رسالے کا ایک خاصہ ہیں۔ نئے اور تجربہ کار افسانہ نگاروں کے تخلیقی شاہکاروں کو جگہ دینا ایک عمدہ روایت ہے، جو اردو ادب کے فروغ میں مددگار ثابت ہو رہی ہے۔ ہر شمارے میں کہانیوں کے متنوع موضوعات، جذباتی گہرائی اور دلکش اسلوب قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔

سفرنامے بھی ''ارژنگ'' کی ایک مضبوط روایت ہیں۔ یہ نہ صرف دنیا کے مختلف خطوں کی سیر کراتے ہیں بلکہ قاری کو وہاں کی تہذیب، ثقافت اور روزمرہ زندگی کے قریب لے جاتے ہیں۔ بیانیے کی شگفتگی اور منظرکشی کی مہارت انہیں اور بھی دلچسپ بنا دیتی ہے۔

انٹرویوز کے سلسلے میں بھی آپ کی کاوشیں قابلِ تحسین ہیں۔ ہر شمارے میں کسی نہ کسی اہم ادبی، علمی یا فنکار شخصیت کا تفصیلی انٹرویو شامل ہوتا ہے، جس سے قارئین کو ان کے خیالات، نظریات اور تخلیقی سفر کے بارے میں جاننے کا موقع ملتا ہے۔ ان انٹرویوز کی بدولت اردو ادب کے اہم ناموں سے قربت کا احساس ہوتا ہے اور نئے لکھنے والوں کے لیے سیکھنے کے کئی مواقع میسر آتے ہیں۔

آخر میں، میں آپ اور آپ کی پوری ٹیم کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں، جو اس خوبصورت ادبی رسالے کو ہر شمارے میں مزید نکھار رہی ہے۔ میری دعا ہے کہ ''ارژنگ'' اسی طرح ترقی کی منازل طے کرتا ہے اور اردو ادب کی خدمت میں اپنا کردار ادا کرتا رہے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

آغا تنویر

عزت مآب حسن عباسی صاحب!

اُمید واثق ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہیں۔ ادبی روایات کا امین 'ارژنگ' ٹیم کی محنت، لگن اور ادبی خدمات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ دعا گو ہوں کہ ''ارژنگ'' اپنی گزشتہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے 2025ء میں بھی اپنے ادبی سنگ میل عبور کرے اور اہداف حاصل کرے۔

پورا پاکستان اس وقت ایک پریشان کن صورتِ حال سے گزر رہا ہے، پروردگار ہماری خطائیں معاف کرے۔ ہماری قوم کو شعور سے نوازیں۔ ہمیں اس ملک وملت کے لیے خیر کا باعث بنائے اور فلاح کے لیے فعال کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

دو کلام بھجوا رہا ہوں، اُمید ہے ادارے کی زینت بنیں گے۔ ڈھیروں نیک تمناؤں کے ساتھ۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص شہزاد دیپ

یہ کتاب غزل کے سنجیدہ قارئین اور طالب علموں کے لیے اہم ہے

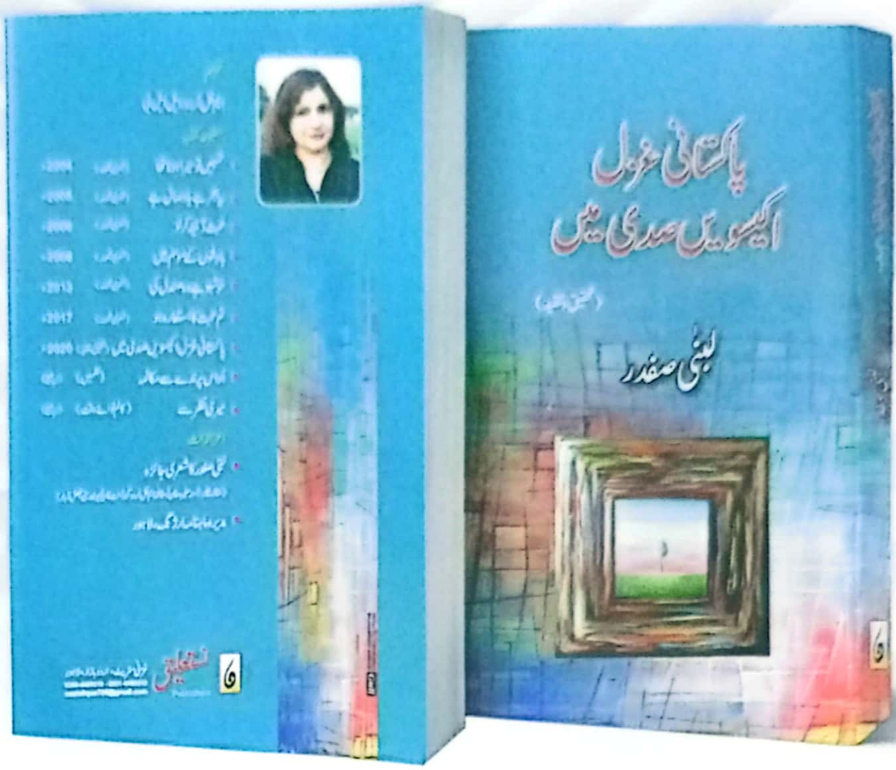

50% OFF

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

صفحات 336۔ کاغذ 80 گرام آفسٹ پیپر۔ کتاب سائز ایگزیکٹو
قیمت 3000 روپے، رعایتی قیمت 1500 روپے

کتاب: ''پاکستانی غزل اکیسویں صدی میں'' - ایک شاندار تنقیدی و تحقیقی کاوش

معروف شاعرہ اور کالم نویس لبنیٰ صفدر کی یہ کتاب جدید اردو غزل کے ارتقا، رجحانات اور عصری تقاضوں کو نہایت خوبصورتی سے اجاگر کرتی ہے۔ اگر آپ اردو شاعری، خاص طور پر اکیسویں صدی کی غزل میں دلچسپی رکھتے ہیں، تو یہ کتاب آپ کے لیے کسی خزانے سے کم نہیں۔

کتاب کی نمایاں خوبیاں

1۔ تحقیقی گہرائی:

یہ محض ایک تنقیدی کتاب نہیں بلکہ ایک جامع تحقیقی دستاویز ہے جو جدید غزل کے بدلتے ہوئے رنگ، اسلوب اور موضوعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ لبنیٰ صفدر نے ادبی حوالوں، مستند تجزیے اور منفرد مشاہدے کے ذریعے قاری کو جدید اردو غزل کی ایک مکمل تصویر فراہم کی ہے۔

2۔ معاصر شعرا کا جائزہ:

اس کتاب میں موجودہ دور کے کئی معروف اور نوآموز شعرا کی غزلوں کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ نئی صدی کی غزل کس سمت جا رہی ہے اور کن فکری و فنی تبدیلیوں سے گزر رہی ہے۔

3۔ تنقیدی بصیرت:

لبنیٰ صفدر نے اپنی منفرد اور مدلل نکتہ نگاہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ جدید غزل محض روایتی محبت کے بیان تک محدود نہیں بلکہ اس میں سیاسی، سماجی، فلسفیانہ اور نفسیاتی پہلوؤں کا بھی حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

4۔ دلچسپ اور رواں اندازِ تحریر:

یہ کتاب نہ صرف ادب کے سنجیدہ قارئین بلکہ عام شعری ذوق رکھنے والوں کے لیے بھی یکساں دلچسپی کا باعث ہے۔ سلیس، شگفتہ اور بامحاورہ اردو میں لکھی گئی یہ تنقید خشک علمی مواد کے بجائے ایک دلچسپ اور فکری طور پر متحرک کرنے والی تحریر ہے۔

5۔ جدید غزل کے نئے رجحانات:

یہ کتاب ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ آج کی غزل میں کلاسیکی روایت کے ساتھ جدید فکر کا امتزاج کیسے تشکیل پا رہا ہے۔

یہ کتاب کیوں خریدنی چاہیے؟

اگر آپ:

- اردو شاعری کی جدید شکل و صورت کو سمجھنا چاہتے ہیں
- معاصر اردو غزل کے رجحانات اور فکری میلانات پر تحقیق چاہتے ہیں
- غزل کے بدلتے ہوئے مزاج اور اسلوب پر بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہیں
- ایک ایسی کتاب پڑھنا چاہتے ہیں جو ادب، تحقیق اور تنقید کو یکجا کرتی ہو

تو ''پاکستانی غزل اکیسویں صدی میں'' آپ کے لیے بہترین انتخاب ہے!

یہ کتاب جدید اردو شاعری کے شائقین، محققین، اساتذہ اور طلبہ کے لیے ایک ناگزیر حوالہ ہے۔ اگر آپ اردو ادب سے محبت کرتے ہیں، تو یہ کتاب آپ کی لائبریری کا حصہ ضرور ہونی چاہیے!

CamScanner

معروف ادیب، شاعر، کالم نگار، مدیر اور مترجم عامر بن علی کا تاریخی ادبی کارنامہ

100 تخلیق کار

شائع ہوگئی ہے

عہدِ حاضر کے نامور اہلِ قلم کے تاریخی انٹرویوز پر مبنی معرکہ آراء کتاب

قیمت 1500 روپے

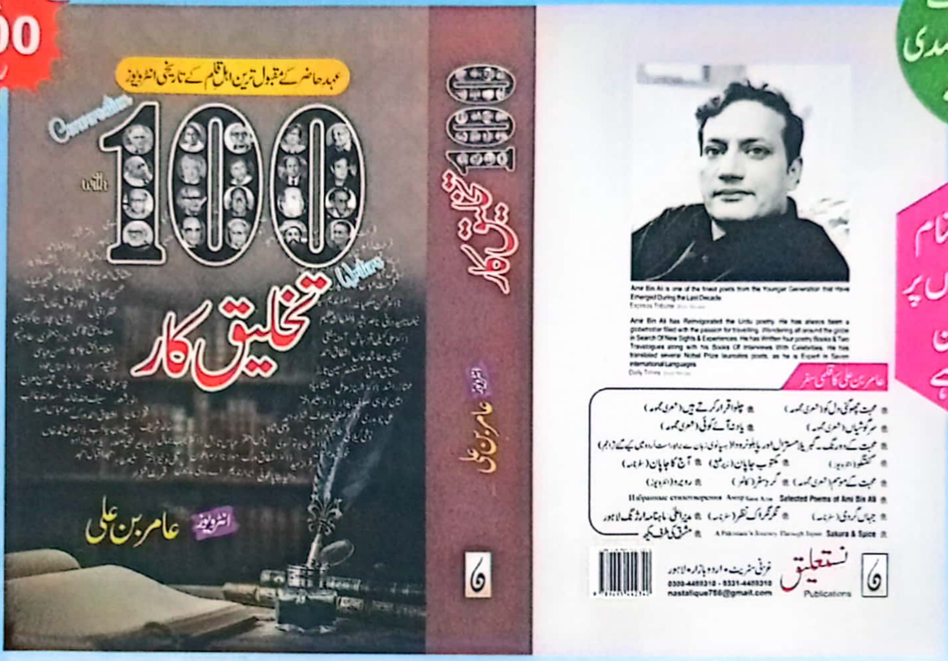

اس کی تالیف کا عرصہ ربع صدی پر محیط ہے

پاکستان کے تمام اہم کتب خانوں پر اور آن لائن دستیاب ہے

تبصرہ نگار: ڈاکٹر انوار احمد......سابق صدر نشین مقتدرہ قومی زبان

عامر بن علی کے پانچ شعری مجموعے پانچ سفرنامے اور کالموں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک کتاب انہوں نے ہسپانوی زبان سے براہِ راست اردو میں ترجمہ کی ''محبت کے دو رنگ...... گبریلا مسترال اور پابلو نرودا''۔ پھر وہ ماہنامہ ارژنگ میاں چنوں لاہور کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ جب وہ 550 صفحات پر مشتمل کتاب کا عنوان رکھیں گے ''عہد حاضر کے مقبول ترین 100 اہلِ قلم'' تو وہ کم و بیش بیس بائیس کروڑ باقی اہل قلم ان سے ناراض ہو جائیں گے۔ اس لیے ان کی تالیف قلوب کے لیے انتساب انہی کے نام ہے۔

میں پاکستان کی پہلی صف کے ادیبوں کے بارے میں اپنی دانست میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ مگر مجھے اعتراف ہے کہ اس کتاب سے پہلے میں نہیں جانتا تھا کہ جناب احمد ندیم قاسمی کو بھی کہا گیا تھا (عبدالکریم چھاگلہ کی دُھن بھیج کر) کہ پاکستان کا قومی ترانہ لکھیں مگر قاسمی صاحب نے اس سے انکار کیا کہ انہیں حکومتِ وقت نے ڈسٹرکٹ جیل کیمبل پور میں سی کلاس قیدی کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ وہ کہتے ہیں اگر لکھتا تو حاکموں کی سفاکی کے بارے میں ہی لکھتا۔ اسی طرح جب اشفاق احمد سے کہا گیا کہ آپ اور ممتاز مفتی نے قدرت اللہ شہاب کو بابا اور بڑا ادیب بنا دیا تو انہوں نے اپنے مخصوص اسلوب میں جواب دیا'' شہاب دو ٹکے کا آدمی تھا، پندرہ بیس آدمیوں نے مل کر شہاب نامہ شہاب کے نام سے چھپوا دیا۔'' کتاب میں کہیں سوال، جواب سے زیادہ دلچسپ ہے جیسے آمنہ مفتی سے کہ عورتوں میں عام طور پر مفتی نہیں ہوتے، مفتی کیسے؟ ہمارے ناصر بشیر نے کتاب دوست اپنے والد کے حوالے سے اپنی والدہ کا شکوہ لکھا ہے کہ اگر تمہارے ابو گھر میں آتے ہوئے دو تین کتابوں کی بجائے دو تین اینٹیں روزانہ لے آتے تو آج ہم کرائے کے گھر میں نہ رہ رہے ہوتے۔ اسی طرح اُستاد محترم ڈاکٹر سلیم اختر کو یاد نہیں رہا تھا، جب وہ عامر بن علی کو بتا رہے تھے کہ میں نے اپنی کسی کتاب کی تقریب رونمائی نہیں کرائی۔ ان کی پہلی کتاب ''نگاہ اور نقطے'' شائع ہوئی تو ہم ملتان میں ان کی ایم اے کلاس کے شاگرد تھے۔ میں سٹیج سیکرٹری تھا۔ یہ تقریب بابا ہوٹل سے متصل خان کیفے ٹیریا (آس جہانی) میں ہوئی تھی۔ استاد محترم خلیل صدیقی نے صدارت کی۔ عرش صدیقی، مسعود اشعر، پروفیسر نذیر احمد، لطیف عارف، عبدالرشید، سید ریاض زیدی، اور فیاض تحسین بھی تقریب میں موجود تھے۔

بھٹو کی پھانسی پر میرے آئیڈیل ادیبوں کا ردِعمل بہت مؤثر طور سے شہرت بخاری کے انٹرویو میں بیان ہوا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں بیٹھے تھے کسی نے فارسی کا شعر پڑھا:

سینہ صد پاک گزارند دل صد پارہ — ایں بے خبراں چاک دریدہ نہ گزارند

شعر سنتے ہی فضا پر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر میں فیض صاحب رونے لگے پھر پطرس بخاری نے رونا شروع کر دیا۔ صوفی تبسم، ن۔م۔ راشد سبھی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ کتاب نستعلیق مطبوعات فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور نے شائع کی ہے۔

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com

CamScanner